U13580 Dut-28-12-09

Title — HAYAAT-E-MOMIN MASAMMA BA TAREEKH-E MOMIN

Creator — Zameer uddin Ahmad Arsh.

Publisher — Sayyed Ishtiyaq Hussain Shauq (Delhi).

Date — 1347 H.

Pages — 144

Subjects — Momin Khan Momin — Sawaneh-o-Tanqeed; Tazkira — Momin Khan Mon

ان من الشعر لحکمۃ و ان من البیان لسحرا

ھو الباقی

حیاتِ مومن

مسمّٰی بہ

تاریخ مومن

۱۳۴۷ھ

ظہوریِ زمان یعنی حکیم مومن خان صاحب مرحوم دہلوی کی باتصویر سوانح

مؤلفہ

مشہور دیار و امصار میر بہار جناب ضمیر الدین احمد صاحب عرش متوطن شہر گیا

یادگار تسلیم و مومن

حسب فرمائش

سید اشتیاق حسین شوق نبیرہ حضرت ظہیر دہلوی مرحوم بازار دریبہ کلاں دہلی

قیمت بڑی شیشی ۸/- فی شیشی ایک روپیہ ۸/-

روغن داد

نئے اور پُرانے داد کی لاثانی دوا

داد ایسی خبیث بیماری ہے کہ یونانی اور ڈاکٹری کسی دوا سے اسکی بیخ و بنیاد نہیں جاتی مگر ہمارے ایجاد کردہ روغن داد کے چند روزہ استعمال سے ہر قسم کا داد نیا ہو یا پرانا انشاء اللہ تعالیٰ بالکل صاف ہوجائیگا۔ اس روغن میں خاص خوبی یہ ہے کہ اسکے استعمال سے کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوتی۔ سو میں ۹۰ مریض کامیاب ہوچکے ہیں۔ بنائٔ علیہ عالیجناب مسیح الملک کے بہادر کے بھانجے اور ہندوستان کے شہرہ آفاق طبیب عالیجناب شمس الاطباء حکیم غلام کبریا خاں صاحب عرف بھورے خاں صاحب نے اپنے مطب میں چھ ماہ تجربہ کرکے براہ عنایت حسب ذیل سارٹیفکٹ عطا فرمایا ہے جو روغن داد کے مفید ہونے کی کافی ضمانت ہے۔

"میں تصدیق کرتا ہوں کہ روغن داد تیار کردہ منشی سید اشتیاق حسین شوق دہلوی۔ داد کے لئے نہایت فائدہ مند ہے۔ اکثر مریضوں پر استعمال کیا نہایت مفید ثابت ہوا۔"

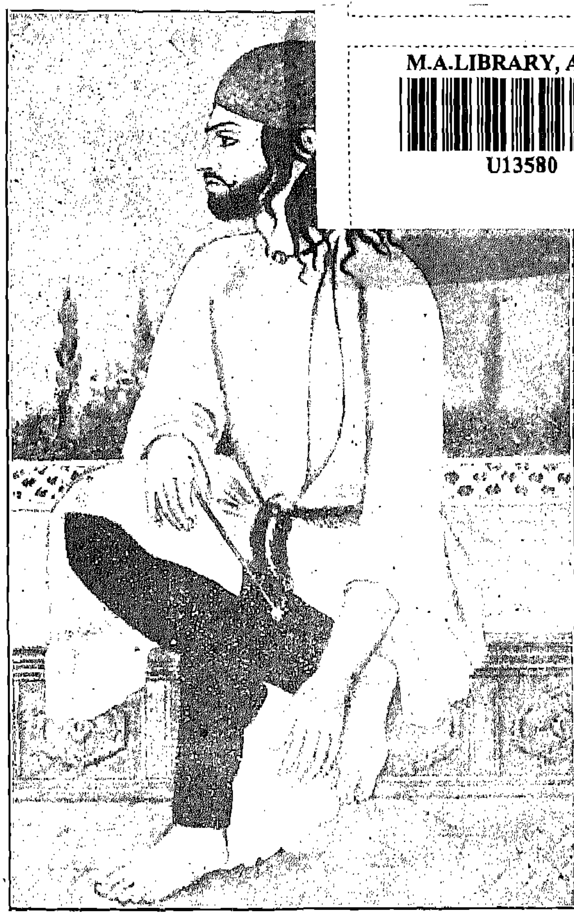
دستخط غلام کبریا خاں

اسکے بہتر فوائد کا سچا استہار یہ ہے۔ ہندوستانی دواخانہ دہلی جو عالیجناب مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب کی سرپرستی میں ہے یہ روغن داد اسی سبب سے ملک کے سب سے بڑے دواخانہ میں بھی فروخت ہورہا ہے۔

موجد سید اشتیاق حسین شوق۔ دریبہ کلاں

دہلی

حکیم مومن خاں صاحب مومن دہلوی



مدّت سے نام سنتے تھے مومن کا بارے آج
دیکھا بھی ہم نے اُس شعراء کے امام کو

فہرست مضامین

التماس ناشر

محسن و محترم ذوالمجد والکرم جناب حکیم مولوی محمد جمیل خانصاحب رئیس اعظم دہلی نے تاریخ مومن کا مسودہ مجھے عطا کر کے اس کی تیاری اور طباعت کا حکم دیا حضرت حکیم صاحب کا حکم حضرت مومن سے عقیدت اور پھر ذاتی مفاد کی توقع ہیں دل وجان سے اس طباعت کی انجام دہی کیلئے آمادہ ہو گیا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ یہ قلمی مسودہ اب خوشنما کتابی صورت میں ناظرین کرام کے روبرو پیش کیا جا رہا ہے اور مجھے اُمید ہے کہ اسے خدمت اُردو کی طرف ایک قدم سمجھکر ارباب ذوق میری حوصلہ افزائی فرمائینگے اور میری ناچیز کوششیں قبولیت کا شرف حاصل کرینگی۔

خاکسار
سید اشتیاق حسین شوق
دھلوی

ازمصنف

نقش ہے سنگِ آستاں پہ ترے
داستان اپنی جبہ سائی کی

خاکسار عرشؔ کا دل جانتا ہے کہ اُسنے اس کتاب کے چھپوانے کی کیا کیا راہ نہ نکالی اور کن کن اُمرائے بامذاق کو نہ لکھا مگر ہر طرف سے محرومی ہوئی بالآخر الہامِ غیبی ہوا کہ توفخرِ حکمائے ہندوستان سرتاج اُمرائے عالیشان رئیسِ بلند اختر صاحبِ علم و ہنرِ عالی جناب علامہ حکیم محمد جمیل خاں صاحب خلف الرشید عالی جناب مسیح الملک ارسطوئے زماں حکیم اجمل خاں صاحب نور اللہ مرقدہٗ رئیس اعظم دہلی کو لکھ۔ چنانچہ ان کی واحد ذات نے میری درخواست کو منظور فرمایا اور اس کتاب کو چھپوانے کا وعدہ کیا۔ اب اس کو اُنکے نامِ نامی و ذاتِ گرامی کے ساتھ معنون کر کے دست بدعا ہوں کہ خداوندِ عالم ان کو حیاتِ ابدی و اقبالِ سکندری عطا فرمائے اور اس کتاب کو مقبولیتِ عام عطا کرے۔ آمین ثم آمین

ہم داد کے خواہاں ہیں نہیں طالبِ زر ہم
تحسین سخن فہم ہے مومنؔ صلہ اپنا

الفقیر الفانی ہیچمدان عرشؔ رحمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

اُردو بیگم (نظم) کی کہانی آپ اُن کی زبانی

سلسلہ شاعری مومن کی آئین

دیباچہ

"یوں تو از دعوئے سعدی کا لال قلعہ میری رنگا رنگ پچکاریوں سے سرتاپا مزین ہے اور اسکے رہنے والے یعنی زبان دان۔ اساتذہ دہلی و لکھنوان جگمگاتے ہوئے بیل بوٹوں سے دلفریبی حاصل کرتے ہی رہتے ہیں مگر انکی آنکھیں صانع کو نہیں ڈھونڈھتیں نہ ان گلکاریوں کے موجد کی ان کو خبر ہے۔ یہی حال چمنستان فصاحت و بلاغت کے گلچیں کا ہے کہ وہ تر و تازہ پھولوں سے اپنے دامن کو اندا دھند بھرتا چلا جا رہا ہے گلدستے تیار کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہے مگر اسکی نظر صرف قدردانوں اور خریداروں پر ہے یہ نہیں دیکھتا کہ پردۂ بہار میں آخر وہ کونسا طوطیِ خوش الحان زمزمہ پرواز ہے جس کے سامنے بلبلِ خوش نوائے شیراز بھی دم بخود ہے۔"

لو میں آج چہرے سے برقع اُٹھائے دیتی ہوں اور تذکرہ مومن کے پردۂ زرنگار سے نکل کے بیٹھتی اور اپنی کہانی تمہیں آپ سناتی ہوں ذرا کان لگا کر سننا اور یاد رکھنا کہ نظم اُردو کی باقاعدہ نیو کب پڑی اور کسطرح اس کی سلسلۂ مومن میں نشو نما ہوئی۔ پرانی تاریخوں سے بھی چاہو ملا لو۔ راسخ عظیم آبادی۔

ہوئے ہیں ہم ضعیف اب دیدنی رونا ہمارا ہے
پلک پر اپنے آنسو صبحِ پیری کا ستارا ہے

آغازِ داستان

عالمگیر کا آخری عہد تھا کہ میں احمد آباد گجرات میں پیدا ہوئی نصیب کا لکھا کہ میری ماں میرے پیدا ہونے کے چند ہی دن بعد مرگئیں صرف ابا جان جنکا نام شمس ولی تھا رہ گئے تھے انپر اس حادثہ جانکاہ کا ایسا اثر پڑا کہ برخواستہ خاطر ہو کے مجھے کلیجے سے لگائے ہوئے وطن سے نکل پڑے خدا بخشے ابا جان تخلص کے ولی نہ تھے بلکہ واقعی وہ اپنے عہد کے ولی اللہ تھے جو بات انکے منہ سے نکلی پتھر کی لکیر ہوگئی اونکی اوقات یاد الہی میں بسر ہوتی تھی اور یہ خاندان کے بزرگوں کا فیض تھا کیونکہ وہ سید شاہ وجیہ الدین اور شیخ نورالدین صدیقی و حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی اولاد میں تھے غرض جب یہ گھر سے نکلے تو سیدھے دلی آئے دلی میں اسوقت بڑے بڑے مشائخ موجود تھے شہر کا شہر تصوف کے رنگ میں رنگا ہوا تھا یہ محمد شاہی عہد سلطنت کی بات ہے میں اسوقت سن شیر خوارگی کے عالم میں گہوارے پر تھی۔ یہ ابا جان اور بزرگان سلسلہ کی کرامت کہئیے کہ مجھے آج تک وہ باتیں یاد ہیں۔ ابا جان اور ناصر علی ایک ہی عہد میں تھے اور ہرچند کہ اسوقت ہر فن کا اہل دربار شاہی کی طرف رجوع تھا مگر ایک ابا جان کی ذات تھی کہ اونکی درویشانہ وضعداری کے ساتھ توکل مرتے دم تک اپنی حالت پر برقرار رہا۔ ہاں جب انکا دم گھبراتا تھا تو کچھ شعر کہہ کر اپنا دل بہلا لیتے تھے۔ اسی عہد میں جب بادشاہ کی طرف سے یہ تفتیش ہوئی کہ یہاں قیام کی وجہ کیا ہے تو یہ فرمایا تھا کہ ؎

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین　　　جا کہو کوئی محمد شاہ کون

دکن کی جگہ اوسوقت فصحا کون بولتے تھے) غرض یہ دلی میں کچھ ایسے آئے اور ایسے بیٹھے کہ مرکے اٹھے۔ یہاں ہزاروں انکے شاگرد اور لاکھوں انکے پیرو ہوئے مگر اہل اور نامی تلامذہ میں شاہ حاتم سے بہتر کوئی نہ ہوا جنکو شاگرد کیا وہ سپوت ولا کہلاتی جنہوں نے

اباجان کے بعد مجھے بے مادر شپد رجان کر اپنی بہن کی طرح اوسچ پوچھو تو میں نے انہیں کے گھر ہوش بھی سنبھالا۔ اسی زمانہ میں ہمنے مرزا رفیع سودا کو پایا یہ شاہ صاحب کے بہترین تلامذہ میں تھے وہ میری بڑی عزت او رخاطر کرتے تھے مگر افسوس کہ ابھی شاہ حاتم زندہ ہی تھے کہ یہ آصف الدولہ کے یہاں لکھنو چلے گئے اور ایسے گئے کہ وہیں کی خاک کے پیوند ہوگئے۔ شاہ حاتم کو بوڑھاپے میں اس پہلوان سخن کی موت کا بڑا صدمہ ہوا سچ ہے کہ انکا اکھاڑہ سونا ہوگیا وہ اکثر روتے رہتے تھے اور ہاتھ مل مل کے سودا کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

کیفیت چشم اسکی مجھے یاد ہے سودا ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

واقعی اگر سودا زندہ رہتے اور کہیں شاہ حاتم پہلے مرجاتے تو وہ مجھے ضرور سودا کے سپرد کرجاتے مگر حکم خدا تو یوں تھا کہ بوڑھے بیٹھے رہیں اور جوان اٹھ جائیں غرض جب شاہ صاحب دنیا سے سدھارنے لگے تو شیخ قیام الدین قایم شاگرد سودا کو بلوایا اور کہا کہ افسوس اپنے وقت کے آگے سودا چل بسا اب تمکو وصیت کرتا ہوں کہ اردو بیگم کو اپنے ساتھ رکھنا اور ہر طرح انکی دلجوئی کرتے رہنا ورنہ میدان حشر میں مجکو ولی کے سامنے منہ چھپانا پڑے گا۔ چنانچہ اس کہنے کو انہوں نے بسر و چشم منظور کیا۔ میاں قایم چاندپور کے شریف زادہ تھے دلی میں آکے بس گئے تھے۔ سودا کے لکھنو چلے جانے کے بعد چونکہ انکی مشق ناتمام سی تھی کبھی کبھی خواجہ میر درد سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ چنانچہ انہیں کے ساتھ میں خواجہ میر درد کی بارہ دری میں جو اب بھی کوچہ چیلاں میں موجود ہے عرسں کے موقع پر اکثر جاتی تھی۔ خواجہ صاحب مجسم تصوف تھے انکا عارفانہ رنگ اردو شعر و نمیں فانوس کے اندر شمع کی لو کی طرح اب بھی بڑی لطافت سے چمکتا ہوا نظر آتا ہے یہ ہرچند کے پیرزادے تھے مگر مجھے بزرگ زادی جانتے اور میری تعظیم کرتے تھے غرض ان آنکھوں سے جانیں کیا کیا دیکھا کہانتک بتاؤں مختصر یہ کہ اس دنیائے فانی

میں ہمیشہ کون رہنے آیا ہے میاں قایم بہی قایم نہ رہے قایم کا ایک شعر میرے دل میں ابتک اپنی جگہ پر قایم ہے ؎

دل ڈہونڈہتا ہے سینے میں مرے بوا لعجبی ہے | اک ڈہیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

غرض جب میاں قایم اور درد دونوں راہی ملک بقا ہو چکے تو مجھے شاہ محمدی مایل نے پناہ دی یہ بہی اک نامی پرگو شاعر تھے غرض مایل کی طرف بہی دلی کے بہت لوگ مایل ہوے یہانتک کہ شاہ نصیر الدین نصیر بہی جنکے ہزاروں شاگرد دلی اور دکن میں ہوئے ان کے حلقہ تلامذہ میں بڑی عقیدت سے داخل ہو گئے۔ اور چند ہی دن کے بعد یہ استاد کے نام کو روشن کرکے فخر اوستاد تسلیم کئے جانے لگے۔ یہ سبب ہوا کہ مایل کے بعد میں نصیر کے یہاں چلی آئی۔ نصیر بڑا زبردست شاعر تہا مشکل زمینوں کو آسمان تک پہونچا دینا۔ اور اس میں چار چاند لگانا اسکے بائیں ہاتھ کا کہیل تہا۔ لال قلعہ میں جب شہزادیوں نے انکی شہرت سنی تو دربار خاص میں جہانپر بادشاہ کا تخت تہا اک مشاعرہ ترتیب دیا گیا اوسمیں میاں ذوق بہی نو مشوقوں کے ساتھ اک کونے سے لگے بیٹھے تھے۔ میں شہزادیوں کے ساتھ محل میں تھی آگے پردے پڑے تھے یوں تو نصیر میرے گہر کا لڑکا ہی تہا اور میں اسکے مکان میں رہتی ہی تھی مگر یہ پہلا اتفاق کہ اوسکو مشاعرہ میں غزل پڑہتے سنا۔ بڑے کڑک دمک کی آواز تھی شعر پڑہنا اور وقتی تصویر کا نقشہ کہینچنا خاص اوسکا کام تہا۔ بادشاہ کے اصرار سے اوس نے کہڑے ہو کر اک قطعہ ایسا پڑہا اور کچھ ایسا بتایا کہ سبحان اللہ سبحان اللہ اک میری کیا سب کی نگاہ میں مجلس کے اندر یہ معلوم ہوتا تہا کہ کوئی یا لوہرن چوکڑی بہول کے کہڑا ہوا اہل بزم کا منہ دیکھ رہا ہے اور میاں نصیر اوسکو بتا کے یہ کہہ رہے ہیں۔ قطعہ

یہ مجنوں سے نہیں آہو ئے لیلے | بہنکر اوستین نکلا ہے گہر سے
جسے تو سینگ سمجھے ہے وہ ہیں خار | لگے ہیں پاؤں میں نکلے ہیں سر سے

سچ ہے کہ شعر گوئی اور شے ہے اور شعر خوانی اور چیز ہے یعنی اسکا بہی اک خاص مادہ ہوتا ہے

مختصر یہ کہ نصیر کا یہ دعوا بے غلط نہ تہا کہ اردو شاعری میرے گھر پیدا ہوئی اور انکی دو پشتوں کے بعد اصغر علی نسیم نے بہی اسی طرف اشارہ کیا ہے ؎

نسیم دہلوی ہم موجد باب فصاحت ہیں — کوئی اردو کو کیا سمجھیگا جیسا ہم سمجھتے ہیں

بہرحال شاہ نصیر نے جب دیوان چندولال کے عہد میں آخری سفر حیدرآباد دکن کا کیا اور دلی سے برخواستہ خاطر ہوئے تو مجکو حکیم مومن خان مومن کے حوالہ کیا۔ مومن نے ہرچند کہ شاہ نصیر سے برائے نام اصلاح لی تہی مگر وہ باوجود مجتہد فن، عالم، فاضل، حکیم اور شاعر ہونے کے میاں ابراہیم ذوق کیطرح اپنے استاد کے دست وگریبان کبھی نہ ہوئے وہ مرتے دم تک نصیر کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنا سعادت دارین جانتے تھے۔ اور یہ اوسی کی برکت تہی کہ غالب سے زبردست شاعر نے جنہوں نے آنکھوں ہی ذوق کو نہیں دیکہا مومن کا لوہا مانا۔ اوسی زمانہ میں جب کوچہ چیلاں والی حویلی میں مومن خاں کے ساتھ میں رہتی تہی اک روز میاں ذوق اس سبب سے کہ دنیا ان جانتی تہی کہ یہ بہی شاگرد نصیر کے ہیں آئے اور دعوت دیکر مجھے اپنے یہاں لے گئے اوسی اونکے مکان کی وہ گز بہر کی نگوڑی انگنائی میں فضا تو دور صاف ہوا تک نہیں پہونچی تہی غرض بندی نے ذوق کے کہنے سننے سے دو پان تو کہائے مگر الٹے پاؤں پلٹ آئی۔ مومن کی شان کو کیا کہیئے وہاں کون نہیں آتا تہا شہزادوں اور امرا کو چہوڑو شعرا میں مرزا نوشہ غالب۔ صہبائی۔ آزردہ۔ تسکین۔ مجروح کی تو روز کی بیٹھک تہی جنکے روزمرہ اور زبان کی اصلاح میں کیا کرتی تہی غرض میر اور سودا کے بعد دلی میں اگر کوئی بزم تہی تو مومن و غالب کی تہی جسکو آسمان کج رفتار نے درہم برہم کرکے مٹا دیا غالب و مومن میں یارانہ تہا۔ مومن خاں کے ابہی مرنے کے دن نہ تھے مگر اتفاق دیکہو کہ کوٹھے سے گر کے گہائل ہوئے اور مر گئے۔ انکا کلیات مرض الموت میں عبدالرحمن آہی خلف میر حسن تسکین شاگرد مومن نے مرنے سے تین دن پہلے مرتب کیا تھا۔

مومن ہر وقت عالم کرب میں رہتے تھے جب کہیں دس دفعہ آہی کچھ پوچھتا تھا تو ایک آدہ مرتبہ وہ ہوں ہاں کر دیتے تھے۔

"صاحب" کہیں عالم سکرات میں آدمی کو دماغ شعر ہوتا ہے۔ غرض اس کلیات کی نظر ثانی تو نہ ہو سکی ہاں ترتیب اور طباعت البتہ بے اعتبار صورت پر ہو گئی اگر اوسپر کوئی اعتراض کرے تو یہ اسکی نافہمی ہے۔ ہمیں یہ جملہ مومن کا یاد ہے جب انہوں نے کلیات اپنے سرہانے سے اٹھا کے ہاتھ میں لیا تو عبدالرحمٰن کو یہ کہہ کے دیا کہ ع حوالت باخدا کردیم و رفتیم۔ تو وہ دہاڑیں مار کے رونے لگا۔ اس واقعہ سے پہلے جب مومن خان سہسوان گئے تھے تو اسوقت ایک نسخہ دیوان کا صاف کیا ہوا انکے پاس تھا اگر آج وہ یا اسکا ضایع شدہ کلام دستیاب ہو جائے مومن کی عظمت وہ چند بڑھ جائے۔ مومن اسکا ذکر بہت اکثر کیا کرتے تھے۔

مومن بستر مرگ پر جب ہوش میں ہوتے تھے تو کبھی کبھی عجیب دل گداز ترنم سے کچھ نہ کچھ اشعار پڑھا کرتے تھے۔ یہ اس آخری رات کا ذکر ہے (یعنی جسکی صبح کو وہ کوچ کرینگے) کہ وہ عالم یاس میں رو رو کر اپنے ان شعروں کو پڑھ رہے تھے۔

گئے وہ خواب سے اٹھ غیر کے گھر آخر شب ۔۔۔ اپنے نالے نے دکھایا یہ اثر آخر شب
مُو سفیدی کے قریب اور ہے غفلت مومن ۔۔۔ نیند آتی ہے بہ آرام دگر آخر شب

غرض یہ شاعر برگزیدہ روزگار ابھی نورکا تڑکا تھا کہ دنیا سے ہاتھ ملتا ہوا چل بسا۔ اک صاحب عشق کی شان بھی یہی ہے کہ شب بھر شمع سوزاں کی طرح رو رو کر بسر کرے اور صبح ہوتے عدم کا سفر کرے اس نامراد کے مرنے کے وقت اسکی آنکھیں میرے چہرے پر تھیں اور اس کے سرہانے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ و نواب اصغر علی خان نسیم یہ دونوں تلامذہ ارشد بیٹھے رو رہے تھے۔ اور سر پیٹ رہے تھے۔ دم آخر مومن کو اجل نے فرصت نہ دی کہ میرے متعلق کسی سے کچھ کہتے۔ آہ انکی جوانمرگی نے ساری دلّی کو ہلا دیا تھا۔ چونکہ مومن کا لڑکا احمد نصیر خاں ابھی محض صغیر سن تھا اسلئے مومن کے پھولوں کے لینے میں وہاں سے

اٹھ کے شیفتہ کے یہاں چلی آئی۔ ابھی اسکو چند ہی سال ہوئے تھے کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے آثار ظاہر ہونے لگے نواب صاحب پر اپنی ریاست کی آپڑی وہ افکار میں اُلجھ گئے۔ جب نواب اصغر علیخان نسیم نے اندرونِ شہر خاکی پلٹن اور گوروں کی آمد دیکھی تو ننگے سر ننگے پاؤں میرے پاس آئے اور قدموں میں گر پڑے میں نے منہ پر پانی چھڑکا تو انہیں ہوش آیا کہنے لگے اب تخت کے ساتھ دلی کی بھی خیر نہیں یہاں رہ کر کیا کروگی۔ میں لکھنؤ جاتا ہوں تم بھی میرے ساتھ چلو وہاں ابھی فنِ شعر کا چرچا ہے۔ اُمرا تمہیں سر آنکھوں پر بٹھلائیں گے۔ غرض میں مصیبت کی ماری لکھنؤ کے سفر کو تیار ہو گئی فوراً ہی ڈولی میں بیٹھی پہلے قطب صاحب کی درگاہ میں پھر سلطان جی میں گئی اور اجازت طلب کی۔ حکم ہوا کہ جاؤ خدا حافظ چنانچہ میں انکی روحِ پاک کو فاتحہ کا ثواب پہونچا کر زار زار روتی ہوئی ڈولی سے اتر کے نسیم کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی اور دلی سے نکل پڑی۔ وہ بھی رونا عجیب رونا تھا کہ لکھنؤ تک ہچکی لگی رہی۔ یہاں میرے آنسو پونچھنے والے میر حسن اور میر خلیق کے بچے تھے جنکی مہمانی میں اوّل اوّل بسر ہوئی۔ پھر نواب محمد تقی خاں سالار جنگ کے سات سو ستاون روپیہ کے وثیقہ دار نسیم کے شاگرد ہوتے اور غیب سے یہ صورت نکلی کہ میں نسیم کے ساتھ نہایت عافیت سے رہنے لگی اسی زمانہ میں ناسخ و آتش کا دیوان میں نے بنظر اصلاح دیکھا تھا۔ اور بحر سحر۔ رشک۔ برق۔ وزیر۔ صبا وغیرہ بھی مجھ سے فیضیاب ہوئے تھے یہ سب تھا مگر گردشِ تقدیر بھی دلی سے جو قدموں لگی ہوئی آئی تھی وہ ساتھ تھی یعنی ایک روز نسیم نے مجھ سے کہا کہ رات میں نے خواب میں اک شعر کہا ہے دیکھئے کیا انجام ہو یعنی ؎

سفر ہے دشوار خواب کب تک بہت بڑی منزل عدم ہے

نسیم جاگو کمر کو باندھو اُٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

اس شعر کا سننا تھا کہ میرا ماتھا ٹھنکا اس واقعہ کو چند ہی دن ہوئے تھے کہ گلشنِ ہستی سے نسیم نے کوچ کیا اور مرتے وقت مجھے اپنا نشان اور مقام یوں بتایا کہ ؎

دور ہم تخلِ گر بنگے صفت گر دنسیم ہم پس مرگ بھی قربان گلستاں ہونگے

انا للہ وانا الیہ راجعون یہ بھی ہو چکا۔ اب بحر غم میں بجز خدا میرا ناخدا کون تھا اسی ٹوٹی ہوئی کشتی کو گرداب بلا سے نکالا یعنی نسیم کے دو سر آوردہ شاگرد لکھنؤ میں تھے جنمیں سے ان دنوں منشی اشرف علی اشرف مطبع نولکشور کی سرکار سے اور شیخ امیر اللہ تسلیم نواب محمد تقی خاں افسر کے دربار سے وظیفہ پاتے تھے۔ ان دنوں میں تسلیم اپنے استاد کے بہت گرویدہ تھے چنانچہ اُن کا ایک شعر ہے ؎

مراجع نالہ موزوں ہے تسلیم تصدق ہے نسیم دہلوی کا

نسیم کے مرنے کے بعد تسلیم کی طرف نواب صاحب رجوع ہوئے اور باقاعدہ شاگرد بھی ہوگئے جسکے باعث تسلیم کی اچھی طرح بسر ہونے لگی اب انہوں نے مجھے بھی سمیٹا یعنی میں انکے ساتھ ہوگئی بس یہی وہ نکتہ تھا کہ میں نے دلی کے پلٹ جانے سے لکھنؤ کے قیام کو زیادہ پسند کیا۔ مختصر یہ کہ محمود نگر میں جہاں تسلیم کا جدی مکان تھا اور جس محلہ میں آتش بھی تھے میں رہنے لگی جب محمد تقی خاں بھی مرگئے تو خدا نے رزق کا دوسرا دروازہ کھول دیا یعنی نواب کلب علی خاں نے تسلیم کو رامپور طلب کر لیا مجھے بھی حسب طریقہ اسلاف تسلیم نے اپنے ساتھ لیا اور میں رامپور چلی گئی مگر گاہے گاہے انکے ساتھ لکھنؤ آجاتی تھی یہ اسلئے کہ تسلیم کا لڑکا تجمل حسین کہ حافظ قرآن بھی تھا اور خوشنویس بھی۔ لکھنؤ میں رہتا تھا۔ تسلیم یوں تو لکھنؤ کے تھے اور لکھنؤ کا رنگ انکے کلام میں بہت ہے مگر کبھی کبھی دلی والوں کے انداز میں بھی لکھتے تھے۔ چنانچہ انکے دو اک شعر یاد بھی ہیں۔

مجھپہ احساں ہے مزارِ پاک کا خاک نے پردہ کیا ہے خاک کا
سوختہ جاں کون سا مدفون ہے کچھ دھواں دیتا ہے پہلو خاک کا

تسلیم سنہ ۱۳۱۱ھ میں رامپور سے آنکھیں بنوانے لکھنؤ آئے میں انکے ساتھ آئی اب کے یہ کچھ ایسا آئے کہ بس یہیں کے ہو رہے۔ اس روشن طبع کے مرنے کی تاریخ

چراغ بہشت ہے خدا انکی قبر کو رہتی دنیا تک روشن رکھے ایکسو تین ۱۰۳ سال کی عمر پائی
اسی علالت کے زمانہ میں تسلیم کے دیکھنے کو سید ضمیر الدین احمد عرش بھی آئے تھے
یہ وہی عرش ہیں جنہوں نے یہ تاریخ لکھی ہے اور تسلیم کے مرنے سے بہت پہلے حیاتِ تسلیم
بھی لکھی تھی۔ یہ کتاب میاں حسرت موہانی شاگرد تسلیم نے چھپوائی ہے۔
غرض تسلیم کے بعد عرش نے مجھسے دست بستہ کہا کہ ہر چند میں پورب کا رہنے والا ہوں اور
پورب کی آب و ہوا حضور کی صحت کے حق میں مضر تو ضرور ہوگی مگر میرا کلیات محتاج
اصلاح ہے آپ میرے ساتھ کیا تشریف لے چلیں میں خدمت لائقہ میں کمی نہ کرونگا
چنانچہ عرش کے بہت کہنے سننے سے میں اس کوردہ مقام میں جو عظیم آباد پٹنہ کے پاس ہے
چلی آئی ہوں اور انکی زندگی تک انشاء اللہ رہونگی۔ تقریباً تین سو ۳۰۰ برس کی عمر میری
ہونے آئی مگر بزرگوں کی دعا سے عالم تجرد میں گزار دی اور اولاد معنوی پر اکتفا ہے
بہت گذر چکی اب ولایت کی ہوا کے جھونکے ہندوستان میں بہت آنے لگے میرا
ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی ٹھنڈا ہوا چاہتا ہے ؎

چراغِ شب ہجر ہیں جل بجھینگے — گجر بجتے بجتے سحر ہوتے ہوتے

اچھا اب رات بہت گزری لو سو رہو۔ کہیں گھبرا کے ایسا نہ کہا ٹھو کہ ؎

سو خدا کے واسطے کر قصہ مختصر — اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانے سے

اب میں بھی نماز تہجد کی تیاری کرتی ہوں۔ شب بخیر صبح ۱۲ سے مومن خاں کے حالات عرش
کو لکھواؤنگی۔ انشاء اللہ۔

رباعی

میزانِ سخن سنج میں تلتا ہوں میں — فکر گھر نظم میں گھلتا ہوں میں
دل رہتا ہے بند قفل ابجد کی طرح — جب حرف شناس ہو تو کھلتا ہوں میں

ابھی صبح ہونے میں دیر ہے جب تک آپ حضرات تمہید ملاحظہ فرمائیں پھر حالات مومن سنیئگا

تمہید

دل اب تو عشق کے دریا میں ڈالا
توکلت علے اللہ تعالے

قبل اسکے کہ مومن کی سوانح عمری شروع ہو۔ چند ضروری باتیں اسکے ضمن میں لکھوں جو معلومات کی بڑھانے والی ہیں۔

ذوقِ سخن مجکو اربابِ بنارس و مرزاپور کی صحبت میں ہوا امیر و داغ و جلال و تسلیم اور شمشاد ہندوستان میں عروج پر تھے۔ میں نے ابتدائی چند غزلیں بغرض اصلاح علامہ مولانا مولوی عبدالاحد شمشاد فرنگی محلی لکھنوی یادگار شیخ ناسخ کی خدمت میں پیش کی۔ یہ وہ وقت ہے جب میں بلند پروازی اور نازک خیالی کا دیوانہ تھا میرے مطبوعہ کلیات میں اُن غزلوں کو دیکھو جنکے حاشیہ پر (ق) ہے۔ مولانا شمشاد علمائے فرنگی محل سے تھے نیز وہ اُستاد کیا استاد گر تھے اور متروکات رشک مرحوم کے پابند تھے یہی سبب تھا کہ کلام انکا آب داری میں کم مگر عیب سے پاک تھا شیخ امیر اللہ تسلیم جنکی مشق کو مستند اساتذہ میں کوئی نہیں پہونچا نہ یہ عمر کسی نے پائی فرماتے ہیں کہ ؎

زہے اوجِ کمالِ فکرِ شمشاد — کہ از ادراکِ حدش عقل حیران

وغیرہ وغیرہ ؎

بگوشِ من زہا لقش آمد آواز — بگو دیوان استادِ سخندان

مولانا شمشاد کی شاعری قلق اور خواجہ وزیر کے زینہ سے اتر بام فلک نما تک پہونچی ہے جہاں ناسخ کا مقام ہے۔ انکا کلام ناسخ و سودا کی بلند طبیعتوں سے ٹکر کھاتا ہے اک مطلع سن لو ؎

ظاہر کرے جو وسعتِ قدرت خدائے چرخ — ذرے کے اک گوشہ کے اندر سمائے چرخ

مجکو جو کچھ انکی صحبت سے فیض حاصل ہوا وہ ناسخ کا صدقہ تھا۔ اسی سبب سے ابتدا میں ہم خود رشکو آبادی اور رشک لکھنوی کے پیرو ہوے اوسی عہد میں صدہا غزلیں ہمنے لکھیں بہت سی پھینک دیں کچھ دیوان میں ہیں یہ اسلئے کہ فصل نکل گئی اک مطلع اسی انداز کا یاد آگیا ہے نذرِ ناظرین کرتا ہوں ؎

ہجر کی شب تھا وہ طوفان دیدۂ پُرآب کا　　　جسمیں خطِ استوا تنکا بنا سیلاب کا

میں کیا خود علامہ شمشاد اخیر میں اس کو محسوس فرمانے لگے تھے کہ اس رنگ کو بدلنا چاہیے چنانچہ وہ تصوف کی طرف آگئے تھے یہاں تک کہ قلق کے بعد اپنا کلام مولانا عبدالعلیم آسی سکندرپوری کو بھی دکھلایا تھا جو اپنے زمانہ کے ایک فقیر منش شاعر اور خواجہ میر درد ثانی تھے۔ آسی کا بھی اک شعر بطور نمونہ سن لو ؎

بے حجابی یہ کہ ہر ذرہ سے جلوہ آشکا　　　اوس پہ گھونگھٹ یہ کہ صورت آجتک نا دیدہ ہے

خیر جب یہ قصے ختم ہو چکے اور اس بزم میں شمع بے نور سی نظر آنے لگی اور میں نے بھی کچھ ہوش سنبھالا۔ تو خیال آیا کہ بہار کے دن نکل گئے آج ناسخ و سودا کے نام ایک سورہ فاتحہ پڑھ کے بخشنے والا کون ہے جو میرے اجڑے مزار پر دو پھول چڑھائیگا غرض طبیعت نے غالب و مومن کی طرف جھکایا مگر یہ شرط لگادی کہ ان کے دشوار پسند انداز سے الگ رہ کر تقلید کرو اور تصوف کی چاشنی خواجہ میر درد کے دسترخوان سے لو چنانچہ یہ ٹوہ لگائی کہ کس کی طرف اپنے کلام کو رجوع کروں اور اب اگر دلّی جاؤں تو کسکے در پر۔ ہرچند کہ میر مہدی مجروح شاگرد غالب زندہ تھے مگر ضعفِ بصارت اور اور پیری کے سبب گوشۂ گمنامی میں بیٹھ چکے تھے اسلئے انکا پتہ بھی نہ چلا اور قسمت کے پھیر نے وہاں تک پہونچنے بھی نہ دیا۔ قدسی و کلیم شیخ امیر اللہ تسلیم شاگرد نسیم کے طرف جھکا۔ اگرچہ وہ تھے تو لکھنؤ کے مگر مرتے دم تک دلّی والوں کا دم بھرتے تھے اور اور دلّی کی راہ سے بھی آشنا تھے اسلئے میں نے یہ سمجھ لیا کہ بس اسی درگاہ سے میری مراد

پوری ہوگی یہیں بیٹھ جاؤ اور چلہ کشی کرو۔ یہاں تک کہ تسلیم کے فیضان نے مجکو اس منزل تک پہونچا دیا جسکی تلاش تھی اور جسکی جھلک میری ان غزلوں میں ہے جنکے حاشیہ پر (م اور ح پاتے ہو۔ اور ضمیمہ تیر و نشتر اوستاد مرحوم کے وصال کے بعد کے روحانی فیضان ہیں اسمیں زیادہ تر میر تقی میر کا انداز ہے جیسے [۱۲] ۔ غرض جب میں نے اس سلسلہ پاک میں ارشاد حاصل کیا تو مومن خاں کے کلام کو محتاج تنقید پایا اور جب اس مسئلہ پر غور کیا تو انکشاف ہوا کہ ہر چند۔ عالم۔ فاضل۔ گریجویٹ۔ تو گلی گلی مارے پھرتے ہیں مگر ان میں ایسے نقاد فن معدوم جو مومن کے نام کو زندہ کر سکیں اور اگر ایسے ماہران فن کی کہیں ڈھونڈھ کی تسلیم بھی کی جائے تو سے

امیر اسوقت کے تسلیم سب نافہم و جاہل ہیں ہنر کی قدر جب کرتے کہ خود بھی باہنر ہوتے

ان غریبوں کی محنت کی داد کون دیگا اون کی کتابیں کون چھپوائیگا۔ خیر تو بطور خود مومن کے متعلق مجھے تین ضروری تلاش پیدا ہوئی ۔

۱۔ اُن کی تصویر کسطرح عالم وجود میں لاؤں۔ یہ اس عہد کی بات ہے جب میں نے استاد تسلیم کو مراد آباد لے جا کے تصویر کھنچوانے پر مجبور کیا ہے یعنی یہ وہ تصویر جو حیات تسلیم مطبوعہ لاہور میں پاتے ہو۔ پھر اُنکی دوسری تصویر درباری انداز میں کھنچوائی سب سے اول رسالہ ادیب الہ آباد میں میرے مضمون کے ساتھ چھپی اور وہی اُنکے تیسرے دیوان دفتر خیال مطبوعہ رامپور اور حیات تسلیم کامل مطبوعہ علیگڈھ میں ہے غرض اس تلاش کو تقریباً تیس سال ہوے ہونگے ۔

۲۔ مومن کے مزار کا پتہ کس طرح چلے ۔

۳۔ موجودہ تاریخوں کے علاوہ مومن کے معدوم حالات کسطرح بہم کیئے جائیں۔

---

[۱۲] عرس بھو کیا راست بچ گئے ہیں پھندے سے دشمنو نکلے اُسکی گلی میں سب تجھے دیکھا نہیں کسی نے
اک شمع کا تمہارا رونا نہ بیچین تھے نکلے رونا تھا اک ہمارا پوچھا نہیں کسی نے

چنانچہ پہلے میں باوجود عدیم الفرصتی ان اغراض کے ساتھ استاد تسلیم کے پاس لکھنو گیا اوسوقت وہ پیر ناتوان ہو چکے تھے۔ سماعت اور بصارت رخصت طلب تھی اک آہ سرد کھینچ کر فرمانے لگے کہ میاں وہ باتیں جو بزرگانِ قدیم یا نسیم سے سُنی تھیں سب فراموش ہو گئیں اب حواس کہاں ہیں اگر سینے میں کوئی خیال موجزن ہے تو وہ صرف مرنے کا ہے اور بس یعنی ؎

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

ددناظرین" آپ صاحبوں کو علم ہو کہ تسلیم نے رام پور میں غالب کو بخوبی دیکھا تھا ناسخ و آتش کے مشاعروں میں عرصہ تک شریک ہوئے تھے۔ سحر۔ رشک۔ منیر سے یارانہ تھا۔ مومن کا عہد بخوبی پایا مگر ان کو دیکھا نہیں تھا۔ غرض جب ایسے در سے یہ جواب محرومی مل گیا تو میری نظیر سکندر کی نظیر تھی جسکو خضر آب حیوان تک لے گئے مگر وہ تشنہ کام و محروم واپس ہوا۔ غرض دل کے ساتھ ساتھ سر پکڑ کے میں بھی بیٹھ گیا اور کسیطرح صحر لئے پرحسرت کی بھاگ رات کاٹی جب سویرا ہوا تو ہمت سے کام لیکر کانٹوں سے بیچ بیچ کے قدم بڑھا یا خضر بھی سامنے سے آنکلے انہوں نے فرمایا کہ ادہر کہاں رام پور کی طرف رُخ کر اب تین سال سے بعد یہ منزل مر مر کر تمام کی یعنی علیگڈہ ہوتا ہوا رام پور کو گیا رستہ میں حسرت موہانی مل گئے انہوں نے کہا کہ مومن کی تصویر کتب خانہ رام پور میں ہے یہ وہ زمانہ ہے جب استاد مرحوم نے لکھنو میں رحلت کی تھی اور رام پور میں ہر طرف اُنکی موت کا چرچا تھا۔ یہاں میں بلبل تسلیم اور دیگر اراکین ریاست کا مہمان رہا اور اک خاص ذریعہ سے کتب خانہ میں بھی گیا مگر بدنصیبی کہ اسی زمانہ میں سنجر طہرانی کا جو ملک الشعرا مرحوم سپہر کے شاگرد اور مہتمم کتب خانہ تھے انتقال ہوا تھا۔ اسلئے کتب خانہ بند پڑا تھا۔ البتہ بعض کہن سال حضرات سے سنا کہ مومن تصویر سے بہت پہلے عہد نواب محمد سعید خان میں اور بعض نے کہا کہ عہد نواب یوسف علیخان میں

میں نواب صدیق حسن خان بھوپال کے ہمراہ رامپور میں تشریف لائے تھے اور اسی زمانہ میں اور انکی تصویر کھینچی گئی تھی اور وہ تصویر ضرور ہے اسکے علاوہ میرے ایک دیرینہ کرم فرما مولانا شاہ مبارک حسین مرحوم متوطن بھوہ ضلع شاہ آباد کہ فقیر حکیم۔ اور منجم بھی تھے اور عرصہ تک رامپور میں مقیم رہے تھے۔ مجھسے آنکھوں کی دیکھی کہتے تھے کہ کتبخانہ میں مومن کی وہ تصویر میں نے خود دیکھی تھی اور اس پر مومن کے قلم سے لکھے ہوئے کچھ شعر بھی دیکھے تھے چنانچہ شاہ صاحب سلہ نے بھی اپنی حیات میں بڑی کوشش کی مگر آخر میں یہ سنا گیا کہ پرانے جو کچھ تھے سب ہٹا دئے گئے غرض انکے علاوہ ایک کیا صدہا کوششیں اس تصویر کے لئے کیں اخبارات اور رسالوں میں تحریک کی مگر وہ نہ ملی نہ ملی۔ اب دیکھئے کہ میری پریشانیوں پر انکی رحمت کو ترس آیا غیب سے مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی۔ (بی۔ اے رجسٹرار ہائی کورٹ حیدرآباد دکن پیدا ہوئے) اور وہ ایک تصویر مومن کی مصور گرامی و ادیب نامی خواجہ امان دہلوی مترجم بوستان خیال کی کھینچی ہوئی جو خود مومن کے رشتہ دار تھے ملک کے سامنے لائے اور تقریباً ایکصدی کے بعد بذریعہ رسالہ اردو حیدرآباد دکن اور پھر بذریعہ رسالہ نگار لکھنؤ ۱۹۲۳ء میں دنیائے ادب کی مشتاق آنکھوں کو مومن کا روشناس کیا۔ مومن کی روح نے تصدیق کرتے ہوئے خود یہ شعر پڑھا کہ ؎

مدت سے نام سنتے تھے مومن کا بارے آج
دیکھا بھی ہم نے اس شعرا کے امام کو

مرزا صاحب دلی کے بہترین فاضل اور ادیب ہیں انکے علاوہ یہ خود استاد فن مصوری بھی ہیں انکا سلسلہ خواجہ امان اور دلی کے مشہور و قدیم نقاش یعنی خاندان محمد فضلی مرحوم سے وابستہ ہے جو عہد شاہی میں ممتاز تھا۔ غرض بہر نوع مرزا صاحب

سلہ خدا بخشے شاہ صاحب بڑے نقاد فن بزرگ تھے اور استاد تسلیم اور مصنف غیاث اللغات کی صحبت بھی اٹھائی تھی افسوس ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے کہ چل بسے مرنے سے کچھ دن پہلے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ لو آج میں بھی میدان میں آتا ہوں ہمارے عزیز مولوی محمد خلیل صاحب ایم اے کہیں اچھے بہترین مومن پرستوں میں ہیں خدا انکو سلامت رکھے

شکریہ دوام کے مستحق ہیں اور یہ تصویر جسکا عکس اس کتاب پر ہے اور اک نئے بلوک سے تیار کی کرائی گئی ہے یہ بھی اُنہی کی عنایات کا صفحہ ہستی پر دم بھر رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ اگر مرزا فرحت اللہ بیگ نہوتے تو میں بھی مومن کی طرح فنا ہوجاتی۔ مومن کیا غالب کی تصویر کو بھی عالم وجود میں لانے والے آپ ہی ہیں۔

خیر جوئندہ یابندہ یعنے تحریک پیہم نے سوتوں کو آخر بیدار کر ہی دیا اور مومن کی تصویر نے بزبانِ بے زبانی یہ کہہ بھی دیا کہ صاحبوں میں اک صاحبِ علم ہی نہیں بلکہ صاحب جمال و وضعدار بھی ہوں۔

سے اب تلاشِ مزارِ مومن کو نکلتا ہوں۔ تقریباً پچیس (۲۵) سال کا زمانہ گزرا کہ میں دلی گیا وہاں چپے چپے زمین کی خاک چھانی مگر کچھ پتہ مزارِ مومن کا نہ چلا کوئی رہنما ہو۔ کوئی آشنا ہے منزل ہو تو بتلائے غرض ٹھوکریں کھاتا پھرا یہاں تک کہ ایکروز سلطان جی میں پہنچکر اتفاق سے غالب کے مزار پر پہونچ گیا جس پر آج بھی میر مہدی مجروح کی تاریخ موجود ہے میں سمجھا کہ شاید مومن بھی اپنے ہمنوا یار کے قریب لیٹے ہوئے ہوں مگر لوگوں نے کہا کہ تم عجب سودائی ہو مومن غدر سے بہت پہلے مرے اونکا مزار جس پر نہ کوئی کتبہ نہ اینٹ تمہیں کون بتائے کہ کہاں ہے اُس عہد کے لوگ مر مٹ گئے اوس زمانے کی دلی پامال ہوگئی تم ہو کہاں۔ اس کہنے پر بھی مجھے چین نہ آیا خواجہ میر دردؔ کے خاندانی مزارات سے قطب صاحب تک کے گورستان اور کتبوں کو ایک ایک کرکے دیکھا مگر مومن کے مزار کا پتہ نہ چلا۔ غرض نہ پوچھو تلووں میں چھالے پڑ گئے اور وہ چھالے میری غربت اور ناکامی پر پھوٹ پھوٹ کے روئے۔ پھر بھی یہ عقدہ حل نہ ہوسکا یہاں تک کہ تنگ آکر وطن کو پلٹ آیا۔ مگر دوستوں دل کی لگی کہاں بجھتی ہے۔ دو سال کے بعد پھر دلی گیا اور مصنف رسالہ آبحیات کے نشان دہنے کا (مہندیوں) میں تلاش کا ارادہ کرکے فراش خانہ کی کھڑکی سے نکلا پہلے فتحپوری

پھر مسجد جامع میں آیا وہاں سے سامنے کی اک گلی پکڑی چلا جاتا ہوں اور ادہر ادہر دیکھتا جاتا ہوں کہ شاید کوئی پیر صد سالہ مل جائے۔ خبر نہیں کن کن محلوں سے گذرا البتہ ایک جگہ مٹیا محل لکھا ہوا دیکھا وہاں اک شریف صورت بوڑھا آدمی بھی نظر آیا اس سے پوچھا کہ مومن خاں کا نام آپ نے سنا ہے وہ کہنے لگا میاں میں شاعر واعر نہیں ہوں اسی محلہ میں اک صاحب سید وحید الدین بیخود رہتے ہیں ان سے پوچھو۔ غرض آگے بڑھ کے اک چھوٹا سا دروازہ نظر آیا جسمیں ٹاٹ کا پردہ لٹک رہا تھا وہاں پہونچ کر بیخود صاحب بیخود صاحب آواز دی کچھ دیر کے بعد ایک پچاس برس کے آدمی کھچڑی دار داڑھی اُٹھے ہاتھ میں حقہ لیے برآمد ہوئے کہا کہ فرمائیے میں ہی بیخود ہوں۔ میں نے عرض کیا حضرت مجھے کچھ اطمینان سے گفتگو کرنی ہے غرض وہ اپنے کوٹھے پر مجھے لے گئے خاطر سے پیش آئے سب حال جو کہا کہ صاحب میں نے مومن کو نہیں دیکھا ہاں انکے بیٹے احمد نصیر خاں کو ضرور دیکھا تھا اور وہ اس کوٹھے پر بھی اکثر تشریف لاتے تھے۔ اب رہا مزارِ مومن تو وہ مہندیوں میں ہے وہاں میرے بھی اکثر عزیز سوتے ہیں چلئے میں لے چلوں۔ غرض وہاں سے چلا اور مہندیوں میں آیا غرض بیخود صاحب ادہر اُدہر دیکھتے بھالتے مجھے ایک ایسے مزار پر لائے جس کا حلقہ اینٹ کا تھا اور اس پر کچھ پھول بھی پڑے ہوئے تھے۔ میں نے فاتحہ پڑھنے کو پڑھی مگر دل میں یہ کھٹکا تھا کہ آج مومن کا کون سا عزیز زندہ ہے جس نے انکے مزار پر پھول لا کے ڈالے ہیں بہرحال جب محافظِ گورستان سے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وہ مزار کسی اور کا ہے اور مومن کا مزار معدوم ہے حالانکہ اسی کے قریب اک قبر میں مومن خاں صاحب پڑے ہوئے ہیں مگر اتنا نہیں کہتے کہ۔

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

سید صاحب کا بڑا احسان کہ آپ نے تقریباً اس ملاقات کے بیس برس بعد مومن کے حقیقی نواسہ جناب سید ناصر حلیم ناصر تخلص۔ وکیل کا پتہ دیا جنکی امداد سے یہ کتاب مالامال ہے۔

غرض عقدہ ایکبے بھی حل نہ ہوسکا اور میں اندرون احاطہ داخل ہوا وہاں حضرت مولانا شاہ عبد العزیز اور اُنکے خاندان والوں کے نام فاتحہ پڑھ کے اپنی قیام گاہ میں واپس چلا آیا۔ اسی سفر اور نشان مشکوک کا ذکر ہمنے عرصہ ہوا رسالہ مخزن لاہور میں بذریعہ اک نظم کے کیا ہے مختصر یہ کہ بہت پریشانی کے بعد وطن کو پلٹ آیا۔

اب چند سال کے بعد پھر دلّی گیا اور ایکبے یہ فیصلہ کرکے چلا کہ کوچہ چیلان میں چل کے رہونگا اور وہیں مومن کا حال معلوم کرونگا چنانچہ اس محلے کے قریب کے ہوٹل میں ٹھہرا اور صبح کو کوچہ چیلاں میں آیا وہاں ایک مختصر سی مسجد نظر آئی جسمیں کچھ طلبا بھی تھے اونکی زبانی یہ معلوم ہوا کہ خواجہ میر درد کی بارہ دری یہی ہے میں نے وہاں پوچھا کہ بھئی کسی ثقہ آدمی کا پتہ بتاؤ تو ان لوگوں نے اک مکان کے طرف اشارہ کیا جسمیں ایک (سائن بورڈ) بھی لگا ہوا تھا۔ اور اس پر حکیم سید ناصر نذیر فراق جانشین درد لکھا ہوا تھا دیکھا کہ کچھ شیشیاں کچھ بوتلیں قرینے سے سجی ہوئی ہیں۔ زمین پر فرش ہے گاؤ تکیہ سے لگے ہوئے اک لال داڑھی والے ضعیف العمر شخص سیاہ مخمل کی اچکن اور بغیر پھندنے کی میلی سی ترکی ٹوپی پہنے ہوئے بیٹھے ہیں صاف رنگ سرخی گالوں پر نمایاں قد متوسط جسم گداز کوئی ساٹھ برس کی عمر ہوگی غرض دریافت سے پتہ چلا کہ فراق صاحب آپ ہی ہیں جنکے ادبی مضامین سے ہندوستان کے مشہور رسالے بھرے پڑے ہیں۔ جب ان بزرگ نے خاکسار کا نام سُنا تو ملکی شہرت کے سبب پہچانا اور بغل گیر ہوئے پان ٹہرلا یا اور اسی ملاقات میں اپنی اک مثنوی موسوم بہ بین بیتی بھی سُنائی اور اسپر مجھے تقریظ لکھنے کو کہا غرض آمدم برسر مطلب میری اُنکی باتیں شروع ہوئیں۔ جب میری سالہا سال کی پریشانیوں کو سُنا تو کہنے لگے آپ بیکار ہیں اتنی مدت سے دلّی کی خاک چھان رہے ہیں اور نئی روشنی والوں کے پھیر میں پڑے ہوئے ہیں وہ مومن کو اور مومن کی عظمت کو کیا جانیں آپ مجھے ملے ہوتے ہیں ان بزرگوں کی کفش برداری کا شرف رکھتا ہوں مومن خاں ہمارے رشتہ دار تھے۔ میرے

گھرانے سے انکے تعلقات۔ خود میرے والد فارسی میں اُنکے شاگرد۔ وہ دیکھو سامنے والا
کوٹھا جو نظر آرہا ہے اُسی پر وہ رہتے تھے اور وہیں سے وہ گرے غرض اُنکے واقعات
سنکر آنکھوں میں آنسو بھر آئے دوران گفتگو میں پتہ چلا کہ یہ وہی فراق ہیں جنکا کچھ حصہ
اُس گاؤں میں بھی ہے جو علاقہ سہسرام ضلع آرہ میں خواجہ میر درد کو شاہان دھلی سے ملا تھا
اسی سلسلہ میں یہ کبھی کبھی گیا جی میں بھی آتے جاتے ہیں۔ بہرحال مجھے یہ ہمراہ لیکر مہندیوں
میں گئے اور ٹھیک اسی مقام پر لائے جسکا نشان آزاد مرحوم نے دیا ہے میں مومن
کی خاکی چہپر کہٹ سے لگ کے خوب رویا اور پھر فاتحہ سے فراغت پائی لیجئے یہ
مُراد بھی پوری ہو گئی اب تک تو میں نے خود اپنے صرف سے اس مزار پر کتبہ لگوا دیا ہوتا
کیونکہ سارے مرحلے فراق صاحب کے ذریعہ سے طے ہو چکے تھے مگر کیا کہوں اک
حادثہ عظیم نے نیز عرش پریس کے مالی ضعف نے مجکو اس سعادت سے محروم
رکھا۔ اب یقین ہے کہ ہمارے محترم کرم فرما جناب ناصر جلیب صاحب وکیل
نواسہ مومن خواہ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی عزیزان مومن
عنقریب انجام فرمائینگے کیونکہ میں بار بار ان حضرات کو متوجہ کر رہا ہوں اور کتبہ
مزار کے لئے مومن کا یہ بہترین شعر بھی نوٹ کرا چکا ہوں ؎

جسے آپ کہتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومن مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جب کوئی نہ کریگا تو انشاء اللہ میں خود اٹھوں گا۔
اب سے ترتیب واقعات مومن کی بحث شروع ہوتی ہے جسمیں مدد کرنے کا وعدہ
سالہا سال سے فراق صاحب نے بھی کر رکھا تھا۔
درحقیقت یہ کام تلامذہ مومن و معاصرین مومن کا تھا جو اک اک کر کے کاروان
دھلی سے آواز جرس کی طرح کچھ رات رہے نکل گئے اور عدم آباد کو آباد کئے ہوئے ہیں

اب غدر کے بعد کے لوگوں میں جو بعض کو اس پر توجہ ہوئی تو وہ توجہ اک سرسری لباس رکھتی ہے پھر ایک صدی کے بعد کا مورخ اگر جان بھی دے دے تو کیا یہ ممکن ہے کہ آج حالات مومن جمع کر لے مگر پھر بھی مرکھپ کر بہ زور زر و پریشانی میں نے جو اطراف ہند اور خاص دہلی کے بچے بچائے بوڑھوں سے حاصل کیا تھا اور جن کو بڑی حفاظت سے اک جزو دان میں رکھ کے بکس کے اندر آج کے لئے بند کر دیا تھا وہ میرے دوران علالت میں ذراسی غفلت کے سبب میری اور غیر مطبوعہ تصانیف کے ساتھ (جسمیں آثار قدیمہ دھلی کے متعلق بارگاہ سلطانی نام اک کتاب تھی اور جسکے کچھ اجزا اچھے اچھے تصویروں کے ساتھ رسالہ ادیب الہ آباد اور رسالہ مخزن لاہور وغیرہ میں چھپے تھے اور نہایت مقبول ہوکر چودہ اخبارات میں اسکی نقل کی گئی تھی وہ اور کچھ حصہ عرش اللغات کا جسمیں تین ہزار سے زیادہ محاورات زبان اردو مع اسناد اور مختصر حالات اساتذہ مندرجہ لغت تھے وہ نیز ڈیڑھ جلدیں مطبوعہ کلیات عرش کی تھیں یہ سب کتابیں) دیمک کی بدولت بری طرح برباد ہوگئیں اور برگ گل کی طرح انکو باد مخالف نے ایسا منتشر کر دیا کہ حشر تک بھی ڈھونڈھنے سے نہیں مل سکتیں نہ وہ دل و دماغ باقی ہے کہ دوبارہ ان چیزوں کو حوالۂ قلم کروں انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

میرے اس درد کو وہی مصنفین محسوس کر سکتے ہیں جنکو خدانخواستہ ایسی روحانی تکلیف پہونچی ہو۔ ورنہ سخن فروشی سمجھیے۔ خدا کا شکر کہ میری ان کتابوں کا ذکر اکثر اخبارات وغیرہ میں ہوتا رہا ہے اور یہی میری راست گوئی کی دلیل ہے۔ بہرحال اب آسمان کج رفتار سے اُسکے نعم البدل کا طلب کرنا عمر رفتہ کو بولانا ہے یہ اسلئے کہ وہ تاریخی بوڑھے قبروں میں جاکے لیٹ رہے ہیں اور اب تو وہیں سے یہ فرما رہے ہیں کہ

کیا کیا نہ بعد مرگ کے آسائشیں ملیں ۔ ہیں قبر میں مسافر منزل رسیدہ ہوں

بہر حال جو ہونا تھا ہو گیا اب باسی کڑہی میں پھر اُبال آیا ہے تو مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ غدر سے پہلے مومن کی حیات میں جب اُنکی بزم اہل کمال سے بھری پڑی تھی اول اول نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کو خیال تذکرۂ شعرا لکھنے کا ہوا چنانچہ انہوں نے اُس زمانہ کے مذاق کے بموجب گلشنِ بیخار[1] نام اک تذکرہ لکھا اُسمیں مومن کا حال بھی رقم کیا مگر افسوس کہ یہ تذکرہ بہ زبانِ فارسی ہے جسکے پڑہانے اور سمجہانے کو غالب مرحوم کا زندہ کرنا لازمی ہے۔ یعنی ایسے دورِ بدترین میں کہ علمِ فارسی ہندوستان کے پردے سے معدوم ہو گیا اور تقریر کیا تحریر فارسی مذموم سمجھی جانے لگی اس کتاب کا عدم وجود برابر نہیں تو کیا ہے۔ کیا شیفتہ دنیا کا رنگ نہیں دیکھ رہے تھے کیا برائی تھی جو اسی تذکرہ کو جو درحقیقت کوئی مفصل تذکرہ بھی نہیں ہے کم سے کم اُردو میں لکھتے نواب صاحب اگر فارسی کے حسرتی تھے تو اُردو کے بھی تو آخر فریفتہ و شیفتہ تھے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ وہ کیا کرتے مرے مٹے بوڈہوں کا نام ہی مٹنا تھا مٹ گیا۔ یہ تذکرہ

[1] مخالفین مومن و مصنفِ آبحیات کے دوستوں نے اُس کا جواب گلستانِ بیخزاں سے دیا اور خوب خوب بے پرکی اُڑائی مگر نگاہ والوں نے تاڑ لیا اس باسی پھول کے ہار کو اُٹھا کے طاقِ نسیان میں ڈالدیا۔ اور بعض اہل ہوش نے یہ سمجھ لیا کہ استغفر اللہ سے چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں ۔ خیر مصنف گلستانِ بیخزاں کچھ ہوں کہ نہوں مگر اُنکے ہوا خواہوں کی ہاں میں ہاں ملانے والے پر اتنا تو کہنا ہی پڑیگا کہ بڈہو میاں بھی حضرتِ گاندھی کیسا ہیں اک چیرم استخواں میں یہ آندہی کیسا ہے ہیں ۔ افسوس اگر حسب وعدہ اپنے آج نواب سر امیر الدین خانصاحب بہادر والئی لوہارو میرے پاس کچھ حالاتِ مومن بھیج دیتے۔ یا جناب آغا طاہر صاحب جو آزاد کے پوتے ہیں پہلے نسبتوں سے آزاد کے مومن کے وہ واقعات جو انہوں نے قلم انداز فرمائے تھے عنایت فرماتے تو سوانح مومن پر کافی روشنی پڑ سکتی تھی۔ اسکے علاوہ متعدد خطوط میں نے اور حضرات کو بھی لکھے مگر کبھی کان پر جوں تک نہ رینگی آہ سے مومن

راز نہاں زبانِ اغیار تک نہ پہونچا ۔۔۔ کیا ایک بھی ہمارا خط یار تک نہ پہونچا

جسوقت لکھا گیا ہے مومن کے علاوہ غالب و ذوق بھی زندہ تھے ۔ مومن نے اسکی تاریخیں بھی لکھی ہیں سنئے ۔

جو ترجمہ ایسے تذکرہ کا بھایا ۔ مومن کو خیال سال تاریخ آیا
مضمون کا ہجوم دیکھ کر فرمایا ۔ کیا گلشن بیخار پہ بادل چھایا

۱۲۵۰ھ

ولہ

ہاتف نے کہی ہے اسکی تاریخ ۔ گلدستۂ گلستان معنی

۱۲۵۰ھ

فارسی ۔ اردو کی بحث سے الگ ہو کر بھی دیکھو تو اس تذکرہ کی وہ صورت نہیں ہے جو یادگار غالب مصنفہ حالی وغیرہ کی ہے ۔ یعنی اسمیں صرف کچھ انشا پردازی کی بہار یا ادبی انداز کی تعریف ہے اور کچھ کلام ۔ بہر حال اسکو بھی غنیمت جانیئے کم سے کم اور اساتذہ کی طرح کمالات مومن کا انکشاف تو ہوتا ہے ۔ مطبع نولکشور میں صرف چند جلدیں باقی رہ گئی ہیں اہل ذوق منگوالیں ورنہ پھر اسکا چھپنا معلوم

غرض جب غدر نے دلی کے گلشن بیخار کو خزاں کے حوالے کیا اور اسکا بلبل یعنی شیفتہ بھی چہک کر اڑ گیا اور صرف اس باغ کی دیوار کے باہر کے کچھ اونچے اونچے درخت رہ گئے تو ان پر زاغ و زغن نے آشیانہ بنایا ۔ کبھی کبھی راتوں کو اونر تو بھی بولنے لگے دلی کی عالیشان عمارتوں کی چھتیں زمین کے سینے سے آلگیں ۔ قلعہ گورہ بارک ہو گیا بچی بچائی ویران مسجدوں میں ابابیلوں نے گھونسلا بنایا ۔ تو ایسے دور بدترین میں میدان خالی پاکر شمس العلما محمد حسین آزاد دہلوی شاگرد خاقانی ہند ذوق نے تذکرہ آبحیات بہ زبان اردو نہایت ہی اچھوتے اور دلکش رنگ میں لکھا حق تو یوں ہے کہ ایسا تذکرہ لکھا نہیں گیا مگر بے عیب ذات خدا کی وفور عقیدت کے جوش میں کوشش کی کہ سارے اساتذہ سے ذوق کو بڑھا دو ۔ یہاں تک بھی مضائقہ نہ تھا مگر اساتذہ سلف پر بیجا

نکتہ چینیاں کیں اور بے طرح کسی نہ کسی آڑ میں دھجیاں اُڑائیں۔ کسیکے شرافت کی۔ کسیکے لیاقت اور صورت کی کسیکے علم و فن کی کسیکے کلام کی۔ گو مجکو اسکی تفصیل کا یہاں موقع نہیں مگر چونکہ سب کے ساتھ دوسرے اڈیشن میں مومن کی بھی خبر لی ہے جسکا مجاز اک شاگردِ ذوق کو نہ تھا نیز ممالک (ریڈی ریفرنس) کو زیادہ پسند کرتا ہو اسلیے ضمناً چند کمزوریوں کو حوالۂ قلم نہ کرنا خونِ انصاف ہے۔ اُمید کہ اساتذہ ذیل کی یادگاروں سے آنسو پونچھ جائیں

۱ حضرت شاہ مبارک آبرو۔ جو غوث گوالیاری کی اولاد سے تھے اُنکے طرف یہ مطلع رجوع کیا گیا ہے۔ آبرو کی آنکھ میں ایک گانٹھ ہے ہ آبرو سب شاعروں کی ...... ہے

۲ حضرت مظہر جانِ جاناں۔ کہ دلّی کے نامی مشائخ سے تھے اُنکا حالِ محبت یوسف ثانی میاں تاباں کے ساتھ۔ یا اُن کا کسی دھوبن کا گھر میں ڈالنا۔ اور حدیثِ اردو کی طرح سودا کی سند میں اک شعر پیش کر دینا۔

۳ میر تقی میر کو کہ سادات سے مشہور تھے نانبائی قرار دینا۔

۴ شیخ امام بخش ناسخ۔ کو اک امیر کا غلام ٹھہرانا۔

۵ بہادر شاہ ظفر کے تین دواوین کو ذوق کا دیوان بتلانا۔

۶ ولی کو کہ نظمِ اردو کے بابا آدم تھے اک مردِ کم استعداد کہنا۔

۷ میر سوز کو کہ نامی اساتذہ دہلی اور نواب آصف الدولہ کے اُستاد تھے یہ لکھنا کہ تخلص اُنکا بروزن۔ گ۔ و۔ ز تھا۔

۸ خواجہ میر درد کہ نامی گرامی مشائخ سے تھے اُنکے نسبت یہ لکھنا کہ کنچنیاں اُنکی بہت مُرید تھیں یہ بیچ میں پڑے کی طرح بیٹھے رہتے تھے جب کوئی اعتراض کرتا تھا تو فرماتے تھے یہ میری ماں بہنیں ہیں۔

۹ مرزا دبیر مرحوم کو جنکا مرثیہ اگر بلندی میں چرخِ نُہم سے جا ملتا ہو تو روشے

رولانے میں بھی یکتا ہے۔ یہ کہنا کہ مرثیہ نہیں اللہ ہو بن سعدان کی داستان ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات نہیں تو کیا ہے۔

مثلاً مرزا غالب بھی ذاتی حملہ سے نہ بچے انکو شیعہ لکھا ہے۔ اسکا جواب حسن نظامی صاحب دے چکے ہیں کہ اگر شیعہ ہوتے تو یہ اُمرائے شیعہ کے گورستان میں دفن کیئے جاتے ساخت بھی ان کے مزار کی جس پر میر مہدی مجروح کا کتبہ ہے ایسی نہ ہوتی اُنکے شیعہ سنی کی بحث پر اک روایت میں نے دہلی والوں سے بنی ہے کہ غالب جب سخت بیمار ہوئے تو جسطرح اپنے اک سنی شاگرد نواب ضیاء الدین خاں کو لکھا تھا اک شیعہ شاگرد کو بھی لکھا کہ اپنے طریقے پر مجھے دفن کر دینا۔ ان حضرات میں غالب کے مرنے سے پہلے جنگ شروع ہو گئی بالآخر مرزا صاحب نے وہ خطوط واپس منگوا کے پھاڑ ڈالے اور فرمایا جب یہ عالم ہے تو جاؤ میں نہیں مرتا۔

مختصر یہ ہے کہ اہل انصاف ایسے قصوں کو شاعری کے اندر لانا پسند نہیں کرتے اس کے علاوہ دوست

وفاداری بہ شرطِ استواری اصلِ ایماں ہے مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

ان اساتذہ کے بعد مومن کے متعلق صفحہ ۲۰۵ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ پہلے دفعہ اس نسخہ میں مومن خانصاحب کا حال نہ لکھا گیا وجہ یہ بھی کہ دو پنجم جس سے انکا تعلق ہے بلکہ دورِ سوم و چہارم کو بھی اہل نظر دیکھ کر جو اہل کمال اسمیں سے ہیں کس لباس اور شان کے ساتھ ہیں کسی مجلس میں بیٹھا ہوا انسان جب ہی زیب دیتا ہے کہ وہی سامان و شان و وضع و لباس کے ساتھ ہو۔ جو اہل محفل کیلئے حاصل ہے نہ ہو تو ناموزوں معلوم ہوتا ہے اس عبارت کے حرف حرف کا جواب میں دینے کو تیار ہوں مگر اولاً تو مضمون کو طوالت دوسرے یہ کہ لوگ بھی فرمائینگے کہ وفورِ عقیدت میں مومن کے اک

شاگرد نے ذوق کے شاگرد سے لڑائی لی ہے

صورتِ لفظِ خموشی سخن آرائی ہے
بے زبانی جو مری ہے وہی گویائی ہے

اب صرف ایک بات اور عرض کرلی ہے یعنی میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ مولانا آزاد نے کوشش کی کہ سارے اساتذہ کو نیچا دکھا کر خاقانیِ ہند کے نام کو بلند کریں۔ اسکی سند میں انکی عبارت ذیل میں ہے ہے

ادا سے دیکھ لو جاتا رہے گلہ دل کا
بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

آبحیات صفحہ ۴۲۰ میں ذوق مرحوم کی شانِ اجلال رقم فرماتے ہیں۔
جب وہ صاحب کمالِ عالم ارواح سے کشورِ اجسام کے طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغِ قدس کے پھولوں سے تاج سجایا جسکی خوشبو شہرتِ عام بنکر جہانمیں پھیلی۔ اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آبحیات اس پر شبنم ہوکر برسا کہ شادابی کو کمہلاہٹ کا اثر نہ پہونچے ملک الشعرائی کا سکہ اُن کے نام سے موزوں ہوا اور اس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اردو کا خاتمہ ہو گیا۔

میں کچھ عرض نہیں کرسکتا آج دنیا اہل انصاف سے خالی نہیں ہے خود فیصلہ فرمائیں کہ میں اگر مومن کے ہی متعلق اس عبارت کو لکھوں یا غالب ہی کے طرف اس کو منسوب کروں تو کیا کوئی مانے گا۔
بہرحال حضرات ناظرین گھبرائیں نہیں یہ پُرآشوب منزل ختم ہوگئی آزاد کا احسان سر آنکھوں پر جنہوں نے عقیدت کا طریقہ بتایا۔ اب دیکھوں میرے دستِ ضعیف سے مومن کے باب میں کیا ہوسکتا ہے۔ خیر کچھ ہو کہ نہو مگر وقت بڑا مبارک ہے

وہ اس طرح کہ مومن کے کمالات کا فیصلہ کرنے کو اک باخبر جماعت تیار ہو گئی ہے جسمیں
ایک راونڈ ٹیبل کانفرنس قایم ہے۔ اور جسکے صدر ہمارے محترم کرمفرما
مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی۔ اے۔ ادیب دہلی یادگار مومن و
غالب اور اُنکے دائیں جانب ہمارے شفیق مکرم مسٹر ضیا احمد صاحب
ایم۔ اے بدایونی لیکچرار علیگڈھ یونیورسٹی ہیں۔ یہ حضرات ان کرسیوں پر
ہیں جو بالکل جواہر نگار ہیں اب اور رنگا جنکی کرسیاں ہیں جن پر سید امتیاز علی
صاحب بی۔ اے۔ حضرت عبدالباری صاحب آسی۔ مرزا جعفر علی صاحب
اثر بی۔ اے۔ حضرت نیاز فتحپوری وغیرہ جلوہ فروز ہیں اور اس کانفرنس کا
میں اک ادنٰے خادم ہوں۔ اب تو مومن کے متعلق انصاف ہو کر رہیگا۔ رسالہ
اردو حیدرآباد دکن اور رسالہ نگار لکھنو وغیرہ نے بھی اس معاملہ کو مدنظر رکھا ہے
مولانا نیاز فتحپوری نے تو ایک جملہ میں سر سید احمد خاں کے خیالات کے کوٹ کوٹ کے
اڑا دیا ہے یعنی وہ مومن کے باب میں رسالہ نگار مطبوعہ جنوری سنہ ۱۹۲۰ میں لکھتے ہیں کہ اگر
میرے سامنے اردو کے تمام شعرائے متقدمین و متاخرین کا کلام رکھکر یہ استثنا سے
میر مجکو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہ دوں گا۔
مجھے کلیات مومن دے دو اور باقی سب اٹھا لے جاؤ۔
مختصر یہ کہ اب مومن کی قسمت جاگی ہیں دعا کرتا ہوں کہ خداوند عالم ان حضرات کی
توجہ کے ساتھ میری محنت کو رائیگاں نہ کرے اور مومن کے ڈوبتے ہوئے بیڑے کو بحر
ناقدردانی سے نکال کے کسی گھاٹ لگا دے یعنی اس کتاب کو ہر دل عزیز بنا دے

علہ یہ منصب ہوا اگر غرش کا نہلانا آسان نہیں ہے بیش ۲۵ برس قبل سے جو تحریک کرتا رہا ہوں آج اسکو انھی کا اثر ماننا پڑیگا
ہندوستان کے متعدد اخبارات اور رسالے اور بالخصوص مخزن اور نظام المشائخ وغیرہ
صفحہ ہستی پر اسکے شاہد ہیں یعنی ع سنگ میں تھا آئینہ جب سے ہی حیرانی مجھے ہے

آمین ثم آمین ؎

چشمِ کم سے نہ نظر مصحفیٔ خستہ پہ کر
وہ اگر آیا تو مجلس میں نظیری آیا

شکر صد شکر کہ رواروی میں اُنکے قلمِ اعجاز رقم سے صفحہ ۱۰۴ میں یہ جملہ نکل گیا کہ خاں موصوف کے کمال سے مجھے انکار نہیں۔ اب میں وہی کہونگا کہ پھر یہ بزم اہل کمال میں جگہ پانے کے قابل اگر نہ تھے تو کیوں خیر ؎

پہلے دعوائے خدائی اس بُتِ کافر کو تھا
کچھ درستی پر جو آج آیا تو انساں ہو گیا

اچھا تو ناظرین کے سامنے اب کمالاتِ مومن کا فیصلہ اُنکے عہد سے ماہرانِ فن کی تحریر کر کے ہٹنا ہے۔ جسمیں پہلی رائے تو خدائے سخن مرزا غالب کی ہے جو اپنے ہمنوا کی موت پر یوں آنسو بہاتے ہیں کہ ؎

کافر باشم اگر بمرگِ مومن
چوں کعبہ سیہ پوش نباشم تا عُمر

دوسری رائے سر سید احمد خاں کی ہے۔ جس کو وہ اپنی بہترین کتاب آثار الصنادید میں درج فرماتے ہیں یہ دونوں فیصلے مومن کے متعلق اُسوقت ہوے جب آزاد کا عدم وجود برابر تھا یہ اُنکی عنانتین ان بزرگوں کے مرنے کے بعد کی ہیں سر سید کی کتاب پر اعتراف کیلئے مومن کے عہد کے لوگوں میں مرزا غالب۔ علامہ صہبائی۔ مفتی صدر الدین خاں وغیرہ کی تقریظیں موجود ہیں۔ صفحہ ۱۰۶ کی چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

زنگ زدائے آئینہ سخندانی۔ مصقلِ مرات ملتہ رانی محی مراسم کمال معانی کشاد فضل جلوہ دہ عرائس مضامین تازہ زیب وسادہ۔ کمالاتِ بے اندازہ سرمستِ نشہ سخنوری نظر باز شاہد معنی پروری۔ غواص محیطِ تدقیق آشنائے بحر تحقیق پیرایہ پیرایہ محامدِ پسندیدہ حُلیہ طرازِ اطوار برگزیدہ۔ غازہ پردازِ چہرہ خُلق محمّدی آثار سعادت ازلی و ابدی۔ یگانہ جہاں حکیم محمّد مومن خاں مومن تخلّص۔

اُنکے کمالات کا اندازہ ظرفِ شمار سے افزوں اور حیطِ تعداد سے بیرُوں ہے معنیٔ تازہ سے قالبِ الفاظ میں جان ڈالنے اور انفاسِ عیسوی سے معنیٔ پژمردہ کو تازہ از گل اور سیراب تر از گُل کرنا اک شیوہ ہے خاص اسی سخن سنج معانی پناہ کا اونکے فروغِ ضمیر سے الفاظ دری کوکب دری اور اُنکی متانتِ طبع سے سخن ریختہ ایوانِ ریختہ۔ اگر یہ کہا جائے کہ شیرینیٔ زبانِ حافظ، نمکِ سخنِ سعدی۔ اور متانتِ ترکیبِ انوری و نشستِ الفاظ خاقانی اور آبانی۔ عبارت ابوالفضل ہندی اور نازکیٔ معانی کمال الدین اصفہانی۔ اور سوا اسکے جو جو خوبی صنفِ شعرا سے کسی کے ساتھ مختص ہے سب اُنکے کلامِ معجزہ نظام میں صرف ہے۔ حق شناسی اور مرتبہ دانی سے بہت بعید اور نہایت دُور از کار ہے حق یہ ہے کہ قسامِ ازل نے سب کو انہیں کے خوانِ استعداد سے منصب ریزہ چینی اور انہیں کے دیگِ کمال سے وظیفہ چاشنی گیری عطا کیا ہے۔ زبانِ ریختہ میں وہ کمال مبداءِ فیاض سے حاصل ہوا ہے کہ سودا اونکے سخن کے رشک سے جنوں اور میر انکے کلام کی خجالت سے مرقد میں سر نگوں ہے۔ قس علی ہذا۔

غالباً ناظرین اب خود یقین کر لینگے کہ صاحبِ آبحیات نے اک جواہر بیبہا کو تہ خاک دبا دیا تھا یعنی کہ اتنے بڑے بڑے فضلا کی رائے ایک طرف ہو اور آزاد تنہا ایک طرف ہوں۔ انکے بعد مجکو بہت بڑی شکایت فراق دہلوی[۳۱] سے ہے جنکی اُمید میں دس سال کا زمانہ بیکار گذر گیا اسکے اندر وہ گیا میں بھی چند بار آئے اور ہمیشہ وعدوں کی بھر مار رہی مگر احوالِ مومن سے نہ خاکسار کو ممنون فرمایا نہ عزیزانِ مومن تک کا پتہ بتایا جنکا ذکر آگے آئیگا۔ آخری عنایت نامہ انکا ۲۹ جنوری سنہ ۱۹ء میں ملا تھا جسکا مجموعہ یہ کہ ہم فقیر دل کو تنگ نہ کرو۔ تیرا خط چاک کر دیا میں دو ستہ قلب ہیں

---

[۳۱] ناصر صاحب کی تحریر اُنکے متعلق ملاحظہ ہو۔ ناصر نذیر فراق میرے عزیز ہیں ... کہ انہوں نے کچھ حالات مومن جمع کیے ہیں جنکو بتانے میں اغماض کرتے ہیں جنہیں وہ ملفوظات۔ اونکو مبارک۔ ع خدا خود میرسامان است ارباب توکل را

(جس کو دورۂ جذب کہئے) مبتلا ہوں۔ میں حیات مومن کی ترتیب میں قطعی مدد نہیں کر سکتا۔ بار بار اُن کے صاحبزادہ کو لکھا انہوں نے یہی جواب دیا کہ آپ کا خط والد صاحب کی خدمت میں لے جانے کی ہمت نہیں پڑتی ڈرتا ہوں۔ فراق صاحب کی اس تحریر کے بعد خاکسار دہلی گیا جسکا ذکر آگے آئے گا اس وقت وہ اچھے ہو چکے تھے مگر ملنے ملانے کا سوال جو عقل کے بجو می سے کوچ پنڈت میں کیا تو اس نے صاف جواب دیا کہ مجھے علم نہیں کہ وہ آزاد کے شاگرد ہیں تیری مدد کس طرح کریں کہ حشر میں اُن کو منہ دکھلانا ہے بہرحال ان تمام بدخلقیوں پر بھی میں فراق صاحب کا ممنون احسان ہوں اور انشاء اللہ رہوں گا۔ ع بس ہو چکی نماز مصلے اُٹھائیے۔

تاج الکلام

آنکھ بغیر ملاکت دل اُجاڑ ہے — چھاتی پہ رات ہجر کی کالا پہاڑ ہے

جب عالم ارواح میں شعرائے اردو و فارسی کی روحیں اشتیاقِ مومن میں مضطرب ہوئیں تو ملائکۂ مقربہ خدمت باری تعالیٰ میں حاضر ہوئے اور سر بسجود ہو کر عرض کیا کہ اے نکتہ شناس راز سربستہ کیا ارشاد ہوتا ہے؟ (یہ وہ وقت ہے جب مومن بعالم جوانی قفسِ عنصری کی کشمکش اور تکالیفِ دردِ جسمانی سے بیقرار تھے) تو اس وقت حکم رب العزت ہوا کہ فرشتہ موت سے کہو کہ وہ جنت الفردوس سے اک تخت مرصع ایسا لے جائے جسکے چتر کا ایک ایک جواہر سات سات خراج کی قیمت رکھتا ہو اور اس پر مومن کی روحِ پاک کو جو ہمارے حبیب کی ثنا خوانی کا سچا پیرو اور شیدائی ہے لاکر شعرائے برگزیدہ و مقبول بارگاہ کی بزم میں ایک امتیازی مقام پر داخل کر دے۔ چنانچہ وہ فرشتہ اک تخت جس کا چتر جواہر نگاری کے سبب خوبصورت ترین بال و پر درخشاں تھا سر پر رکھے ہوئے ہوا کے دم پر دست بستہ حاضر ہوا اور مومن کو حکم خدائے عزوجل نیز عالم ارواح کے مقامی شعرا کے اشتیاق سے بھی آگاہ کیا انہوں نے شان عبودیت کے بموجب بسر و چشم انجری ہوئی دلی سے اعلٰے علیین کے قیام کو زیادہ پسند کیا اور بسم اللہ مجریہا و مرساہا کا نعرہ لگاتے ہوئے بحرِ فنا میں قدم رکھ دیا۔ ہوا کے تھپیڑوں نے اس تخت کو آغوشِ محبت میں کشتی کی طرح لیکر فرشتہ موت کی ناخدائی کے سہارے پر دم بھر میں اس مقام معینہ کے قریب پہونچا دیا جہاں کسی بلند پایہ شاعر کا

طایرِ خیال تک نہیں پہونچ سکتا ہے۔
وہاں حکم باری تعالےٰ سے حفظ ماتقدم کو ایک طرف ظہوری۔ نظیری۔ و عرفی۔
دوسرے طرف ولی۔ میر۔ و سودا کی روحیں ایسے نادر مورچھل لئے کھڑی تھیں جنکا ستہ گیا
ہو رہے۔ لعل۔ اور زمرد کا تھا غرض یہ تخت رواں اُس بلند امتیازی مقام پر رکھ دیا
جہاں سے بام عرش کا زینہ ملا ہوا تھا۔ علاوہ ان بزرگوں کے جنکا ذکر آیا بے شمار
شعرائے نامی گرامی کی روحیں حاضر ہوئیں اور سر جھکا کے اشتیاقِ کلام ظاہر کیا اور
دلّی کی حالت پوچھی مومن کہ ادب آموزِ ازل تھے اس تخت پر جس کا ذکر آگے آچکا ہے
دو زانو بیٹھ گئے اور کہا کہ مدت ہوئی ترکِ سخن کر چکا اب یہ کہ دلّی کا حال تو وہان
ایک غالب کا دم رہ گیا ہے یعنی یہی ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ ہے جو اس بزم کو روشن
کئے ہوئے ہے جہاں صف بستہ شیفتہ۔ نسیم۔ صہبائی۔ ممنون۔ آزردہ۔ رخشاں
مجروح۔ وغیرہ بیٹھے فنا کا دم بھر رہے ہیں اور آپ حضرات کا نوحہ پڑھ رہے ہین
اتنے میں شاہ نصیر کی روح پاک سامنے آئی۔ اور ذوق کا حال پوچھا۔ مومن نے
دست بستہ عرض کیا کہ بادشاہ کی مدح اور قصیدہ گوئی میں محو ہیں۔ یہ سنکر شاہ
نصیر کی روح ایک طرف کو چلی گئی۔

صاحبو! مختصر یہ ہے کہ پیروانِ علمِ حدیث۔ مشتاقانِ جہاد۔ طالبانِ جامِ
شہادت۔ کی سچی شان جو مومن کے دیوان سے بھی ثابت ہے یہ اُسی کی برکت
کہ خدا نے ان کے بسترِ پاک کو احاطہ مولانا شاہ عبدالعزیز و مولانا
شاہ ولی اللہ قدس سرہ کے قرب میں پہونچا دیا جہاں سے وہ ان علما کے ساتھ
حشر میں اُٹھائے جائینگے اور اُن کی روح پاک وہاں پہونچا دی گئی جہاں
آٹھوں پہر آبِ حیات کے عوض بارشِ رحمت ہوتی رہتی ہے
اُن کی بزم وہ بزم ہے جہاں ہر وقت باغِ بہشت کے جھونکے پہونچتے

رہتے ہیں۔ جہاں گلشن فردوس کے تر و تازہ پھولوں سے رنگ برنگ کے گلدستے سجائے جاتے ہیں۔ جہاں حوریں بناؤ سنگار کئے بیٹھی ہوئی خود ان کی غزلیں گایا کرتی ہیں۔

غرض حق بہ حقدار رسید۔ اہل عشق کے جو مرتبے ہوا کرتے ہیں وہ مومنؔ مرنے کے بعد حاصل ہوئے اور اُسی عشق کے زینے سے یہ زمین سے آسمان پر پہونچ گئے اب اور کسی کو دنیا کی ملک الشعرائی اور مملکت شعر کی بادشاہی مبارک ہو جو اس بلندی کے آگے پستی ہے۔ یہاں تو سے

خود رفتگی میں چین وہ پایا کہ کیا کہوں
غربت جو مجھ سے پوچھو تو بہتر وطن سے ہے

حالاتِ مومن

خاندان۔ وطن۔ صورتِ معاش۔

آپ علوی سادات[1] ونجبائے کشمیر سے ہیں۔ اصل وطن آپ کے بزرگوں کا کشمیر ہے جسوقت کہ شاہ عالم کی سلطنت کا چراغ خاموش ہونے کو بھڑک رہا تھا آپ کے بزرگوں میں دو بھائی حکیم نامدار اور حکیم کامدار۔ دہلی میں آئے اور شاہی اطبا میں داخل ہو کے خانصاحب کے خطاب سے ممتازِ دربار ہوئے۔ یہ لوگ جب دلی میں آئے تو کوچہ چیلاں میں جہاں اُن دنوں اکابرِ روزگار کا مسکن تھا قیام کیا۔ اور یہاں وہ راحت پائی کہ پھر وطن قدیم کو نہ پلٹے صلۂ خدمت میں بادشاہ کے طرف سے پرگنہ نارنول کے چند مواضعات جنمیں موضع بلاہہ بھی تھا بطور جاگیر عطا ہوئے کچھ دنوں بعد ان دونوں بھائیوں کی نام پر دو خاندان ہوگئے۔ یعنی نامدار خانی اور کامدار خانی۔ نامدار خانی میں مومن خاں ہوئے اور کامدار خانی میں مسیح الملک حکیم اجمل خان وغیرہ ہوئے۔ مومن کے یہ بزرگ صرف شاہی حکیم نہ تھے بلکہ ان سے وزارت صوبہ داری سر صوبہ وغیرہ کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ یہ حضرات جب اس خدمت کے سلسلہ میں صوبہ بہار کے طرف آئے تو چند مسجدیں بھی تعمیر کرائیں۔ (چنانچہ نوادا ضلع گیا میں ایک مسجد انکے نام پر ہنوز موجود ہے مگر یہاں بجائے صوبہ دار کے انکے ناموں کیسا تھ

---

[1] تذکرۂ شعراء مولفہ نواب صدیق حسن خاں والئے بھوپال۔ اور بہ تصدیق انکے نواسہ مومن جناب سید ناصر حبیب صاحب۔ وکیل ریاست دتیا ضلع بندیلکھنڈ کا خط دیکھو جسمیں وہ اسکی تصدیق فرماتے ہیں نیز ہندوستان میں آج سینکڑوں ایسے ہیں جو خانصاحب اور خان بہادر کے خطاب کی بدولت سید سے پٹھان مشہور ہو گئے۔ مختصر یہ کہ مومن پٹھان نہ تھے۔

راجہ مشہور ہے۔ بہرحال یہ سب انقلابات ہستی کے تاثیرات ہیں۔ رعایا نے امراؤ راجہ کہا تو کیا غلطی کی۔ خیر جب سرکار انگریزی نے جھجھر کی ریاست نواب فیض طلب خاں کو دے دی تو پرگنہ نارنول بھی اُسی کے ساتھ ساتھ نکل گیا اب کہ شاہی اثر معدوم ہو گیا تھا نواب نے مزدور و معذور جان کر اُنکی جاگیر خاندانی ضبط کر لی اور صرف ہزار روپیہ سالانہ پنشن اس خاندان کی مقرر کر دی چنانچہ حکیم مومن خاں کو کہ حکیم غلام نبی خان وار حکیم نامدار خاں کے بیٹے تھے پانسو روپیہ ترکہ خاندانی حاصل ہوا اسکے علاوہ اُنکے خاندان کے چار طبیبوں کو سرکار انگریزی کی طرف سے بھی سو روپیہ ماہوار کی پنشن مقرر ہو گئی جسکے ایک چوتھائی کے وارث حکیم مومن خاں ہوئے۔ غرض یہ ممتاز خاندان عہد شاہی سے لیکر غدر سے پہلے تک نہایت فارغ البالی کے ساتھ امیرانہ زندگی بسر کرتا رہا اور اس خاندان کا ہر طبیب شاہی خصوصیت کے سبب رئیسانہ شان و شوکت رکھتا تھا چونکہ حکیم نامدار خاں کا خاندان علم آبائی کے لحاظ سے حکیم مومن خاں کی ذات پر تمام ہو گیا اسلئے اُنکی اولاد دنیا پرستی اور گمنامی کی حالت میں پڑ گئی۔ دوسرے طرف برعکس اسکے حکیم کامدار خاں کا خاندان ہے جسمیں مسیح الملک کی پھونکی ہوئی روح حشر تک کام کرتی رہے گی ع میراث پدر خواہی علم پدر آموز۔

ناظرین یہی وہ سبب تھا کہ مومن اپنے عہد کے برائے نام[عله] بادشاہ یا کسی نواب یا رئیس کے محتاج نہ ہوتے گھر بیٹھے جو میسر آتا تھا اُسی کو بہت سمجھتے تھے انہوں نے اطبائے عام کیطرح مطب بھی نہ کیا نہ حکمت کی روٹی کھائی کبھی کوئی علاج معالجہ کیلئے رجوع ہو جاتا تھا تو انکا بھی نہ کرتے تھے آجکل کیطرح اُس زمانہ میں کوئی

عله سلطنت بیجان سی تھی اسلئے بادشاہ کے مصاحبوں کو جیسے ذوق وغیرہ تھے مومن سگان جیفہ خوار کہتے تھے۔ اور ذوق انکے صاف منہ آگے بگڑتے تھے۔ یہ بھی سبب نفاق کا ہے

فیس نہ بھی غربا کا علاج مفت کیا جاتا تھا امرا جو بطور نذر حقِ خدمت دے دیتے تھے وہ لے بھی لیتے تھے۔

ولادت - نام - اور تعلیم -

سنہ ۱۲۱۵ھ انکا سنِ ولادت بتایا جاتا ہے۔ اُسی محلہ میں جسکا ذکر اوپر آچکا ہے پیدا ہوئے یہیں حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز کا مدرسہ بھی تھا اور اسی کے قریب حکیم غلام نبی خاں کا مطب بھی۔ اسلئے ان حضرات میں مراسم تھے۔ چنانچہ جب مومن پیدا ہوئے تو اُنکے والد شاہ صاحب کو بُلا لائے اور انہیں سے کان میں اذان دلوائی اور نام کیلئے کہا تو شاہ صاحب نے مومن علی نام رکھ دیا۔ گھر والوں کی طرف سے دوسرا نام حبیب اللہ پیش کیا گیا مگر شاہ صاحب نے فرمایا نہیں۔ عورتوں نے پھر دست بستہ عرض کیا کہ حضور مومن تو جولاہے کو کہتے ہیں کوئی اور نام رکھ دیجیے حضرت نے فرمایا نہیں اسی نام سے یہ دنیا میں نام پائیگا۔ آخر وہی ہوا یہاں تک کہ جب یہ شعر کہنے لگے تو تخلص بھی مومن ہی رکھا اور اُنکے اُستاد نیز دوستوں نے بھی اسکو پسند کیا۔ اور جب سب نے پسند کیا تو خدا کو بھی مقبول ہوا یہاں تک کہ یہ اپنے اعمال صالحات کے باعث واقعی حبیب اللہ ہوئے اور بشان مومن دنیا سے اُٹھے۔ سچ ہے ع عملِ نیک ہی انسان کے کام آتے ہیں۔

تعلیم بھی اُنکی اسی مدرسہ میں ہوئی کچھ کتابیں تبرکاً شاہ عبدالعزیز صاحب اور بقیہ مولانا شاہ عبدالقادر سے پڑھیں۔ اور یہیں عربی۔ فارسی۔ حدیث۔ فقہ۔ منطق۔ معانی وغیرہ کی تکمیل ہوئی۔ ذہن خداداد کا یہ عالم تھا کہ شاہ صاحب کا واعظ جو علاوہ علوم ظاہری کے نکاتِ باطنی سے بھی بھرا ہوا ہوتا تھا جو ایک روز سن لیتے تھے تو بے فرق دوسرے روز اپنے والد کے مطب میں بیٹھ کے دوہرا دیتے تھے۔ مزا تو یہ تھا کہ مومن نکاتِ باطنی اور اسرار سینہ کو بھی اُسی طرح بیان کر دیتے تھے جس کی بابت حضرت

شاہ صاحب کی تفسیر ناتمام میں موجود ہے ع خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

مومن اپنی ذہانت میں بجز مولوی محمد اسمعیل صاحب شہید یا خواجہ محمد نصیر رنج کے اپنا ہم پایہ کسی کو نہ سمجھتے تھے

طبیعت انکی ازل سے بہت دقت پسند واقع ہوئی تھی۔ یہی وہ سبب تھا کہ سعدی کی گلستاں کو بھی جو ذکر آجاتا تھا تو یہ کہتے تھے کہ رفت۔ رفت۔ گفت گفت۔ کے سوا اسمیں کیا دھرا ہے یہ فرمانا انکا کسی نخوت کے سبب نہ تھا بلکہ اپنی طبیعت کے وہ کیا کرتے بچپن ہی سے ظفرا اور ظہوری کی طرف جھکاؤ تھا۔ میر تقی صاحب کیطرح بد دماغیوں کے الزام سے یہ بالکل پاک رہے۔ نہ کسی مورخ نے انکی شکایت لکھی نہ اوروں کیطرح کسی سے تو تو میں میں ہوئی۔ ایک جگہ آزاد نے جو آغا جانی ہدہد کے گھونسلے میں مومن خانی باز کا گھس جانا بیان کیا ہے سخن فروشی ہے اسلئے کہ مومن کے شاخسار سخن میں الو۔ زاغ و زغن۔ بازہ بھری کہاں وہاں تو عشق اور آہ آہ کے فیضان سے صرف کوئیلوں قمریوں اور پپیہوں کا گھونسلا تھا۔ اور انہیں کے دردناک نغمے سنے بھی جاتے تھے۔

اک مغموم طبیعت انسان جو زخم خوردہ ہو قدرتی طور پر زندہ دل نہیں ہو سکتا اس مصنوعی قصے سے غرض آزاد کی ایسی قدر ہے کہ وہ حکیم آغا جان کے مقابلے میں مومن کو شکست دیں مگر دنیا آج بھی بخوبی اس فیصلہ کو تیار ہے کہ حکیم آغا جان عیش اور مومن میں کیا فرق تھا۔ [سلہ] آگر یہ واقعہ صحیح بھی ہو تو ہدہد کے پر دیال باز نے نہ نوچے ہوں یہ کیسے مانوں۔ بہرحال جب مومن اچھے خاصے عالم ہو گئے تو خاندانی فن

سلہ عیش کے ان شعروں سے خود پتہ چل جائیگا کہ ان میں اور مومن میں زمین اور آسمان سے زیادہ کا فاصلہ ہے

زہد و تقوے دھرے رہے سارے ہاتھ سے اُسکے مے پیتے ہی بنی

کس کا تھا پاس شوق ظلم اے عیش ان جفاؤں پہ بھی جیتے ہی بنی

کے طرف رجوع یعنی اپنے والد اور چچا غلام حسن خاں اور حکیم غلام حیدر خاں سے طب کی تکمیل کی۔ اور انہیں کے مطب میں طریقہ تشخیص کے ساتھ نباضی اور نسخہ نویسی پر غور سیکھی اور ان بزرگوں کے انتقال کے بعد اُنکے جانشین ہوئے اس فن میں یہ آبرو پائی کہ اب تک طب کی بڑی بڑی کتابوں میں اُنکے نام پہ نسخے موجود ہیں۔ درحقیقت یہ اُنکی انتہائی ذہانت تھی کہ یہ موجدان فن طب کے نقش پا تسلیم ہوئے اور صاحب تصنیف بھی ہوئے

نجوم اور شطرنج وغیرہ

اسکے بعد یہ علم نجوم و رمل وغیرہ کے طرف جھکے آئیں وہ وہ کمالات دکھلائے کہ حد بیان سے باہر ہے انشاء اللہ اُسکا ذکر آگے آئیگا۔

اب یہ تفریح طبع کیلئے شطرنج کے طرف مائل ہوئے اس فن میں بھی وہ کمال پیدا کیا کہ دہلی کے مشہور شاطر کرامت علیخاں کے سوا جو انہیں کے گھرانے کے تھے اور کوئی اُنکی نظر میں نہ جچتا تھا۔ دلّی اور غدر سے پہلے کی دلّی جبکہ گھر گھر اُمرا اور شرفا نے بساط بچھا رکھی تھی یہ اُنکا معمولی کمال نہ تھا کہ شہزادہ مرزا رحیم الدین حیاؔ کو جو نقشے کے ذریعہ سے حل کرنے کیلئے ولایت کے آتے ہوئے مشکل نقشے حل کرتے تھے وہ دیکھکر یہ جو فتح و شکست کا حکم لگا دیتے تھے وہ نوشتہ پتھر کی لکیر کیطرح ہمیشہ کیلئے قایم ہو جاتا تھا۔ اس فن میں انہماک کی یہ صورت تھی کہ صبح کو بیٹھے تو چراغ جل گیا اگر شام کو بیٹھے تو صبح ہو گئی کھانے پینے کا بھی ہوش نہ رہتا تھا کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بساط کے کسی خانہ سے پیادہ کے ساتھ صبح کو نکلے تو منزل طے کرکے دوسری صبح کو گھر پلٹے۔ شہزادہ مرزا رحیم الدین حیاؔ اس فن میں اُنکے شاگرد رشید تھے یہ وہی حیاؔ ہیں

کہ حیاؔ کے دو شعر بطور یادگار حاضر ہیں سُن لو پھر ان بوڑھوں کا نام کون لیگا ؎

موت ہی بارہ سازِ فرقت ہے — رنج مرنے کا۔ مجکو راحت ہے

تم بھی اپنے حیاؔ کو دیکھ آؤ — آج اُسکی کچھ اور حالت ہے

جو عہد نواب یوسف علیخاں میں دہلی سے رام پور گئے اور پھر نہ پلٹے۔ ان کا خاندان ہنوز وہاں موجود ہے۔ شیخ امیر اللہ تسلیم مرحوم بیان فرماتے تھے کہ وہ ایک مرتبہ غدر سے پہلے جب نواب کلب علیخاں بہادر ولی عہد تھے ایک مشاعرہ میں شریک ہوئے دیکھا کہ ایک امتیازی مسند پر شہزادہ صاحب موصوف بیٹھے ہیں جب میں نے یہ مطلع پڑھا ہے کہ۔

یادگار ہستی و موہوم ہم رکھتے نہیں
صورت عمر روان نقش قدم رکھتے نہیں

تو شہزادہ صاحب نے پیچوان چھوڑ دیا اور پوچھا کہ آپ کس کے شاگرد ہیں میں نے کہا نسیم شاگرد مومن... عرض کے فرمائے لگے آپ خوب کہتے ہیں وہی ہیں جیران تھا کہ لکھنو والے اس رنگ کو کیا جانیں وہ تو انگیا کرتی کے مضامین خوب کہتے ہیں۔ شہزادہ صاحب کا ذکر مسمی اسمٰعیل منیر شکوہ آبادی شاگرد ناسخ ورشک مقیم رامپور نے بھی کیا ہے۔ اور انکی مثنوی کی تعریف کی ہے۔

مومن شطرنج اور رمل وغیرہ کے شوق کے بعد بھی چلن سے نہ بیٹھے۔ علم موسیقی ریاضی صنعت و حرفت میں سادہ کاری میں آتش بازی وغیرہ میں بھی ایجاد کا مادہ انہوں نے پیدا کیا۔ ان فنون سے دلچسپی رکھنے والے مومن خاں کے دربار میں برابر آیا کرتے تھے۔ اور فیضیاب ہوتے تھے۔ سادہ کاری کی چیزیں خود انکی بنائی ہوئی ان کے خاندان میں موجود ہیں

اب ناظرین خود فیصلہ فرمائیں کہ ایسا جامع علوم و فنون شاعری کے طرف رجوع ہوتا ہے پھر وہ کس پایہ کا شاعر ہوگا اور اُسکے اشعار کس طرح عام فہم ہو سکتے ہیں غرض۔ ہم اسے روشنی طبع تو یر من بلا شدی۔

کثرت علوم و فنون نے اُنکو اور بھی نازک خیالی اور مشکل پسندی نیز داخلی مضامین کے طرف جھکا دیا تھا یہی سبب ہوا کہ آج انکا کلام زبان زد خاص و عام نہیں پھر بھی

غالب کیطرح (جو علوم وفنون میں اُنکے برابر نہ تھے اور جنکی شہادت کو صفحات تاریخ موجود ہیں) انکا کلام بھی اگر انکے معاصر اُنکی حیات میں یا اُنکے بعد لے لیتے اور انتخاب کر دیتے تو ہرگز یہ گوشہ گمنامی میں نہوتے ۔ کسے کم بینا لکے پہلو بہ پہلو ضرور نظر آتے ۔ یہ بھی نہ سہی کہ مومن کو حیات محض مختصر ملی ورنہ وہ خود اپنی پیری کو پہنچ کر اسکو مجموعہ کر لیتے سکے دنیا کا مذاق بدل گیا ہے نیز آگے چل کر اور بھی بدل جائیگا ۔ بہر حال نیز اگر کان یہ ہوتا اور وہ ہوتا اس مرثیہ خوانی سے کیا ہوتا ہو کسے کم اگر یہ استغنائی کو چھوڑ دیتے تو آج گھر اشرفیوں سے بہرا ہوا ہوتا مگر جب مقدر کا یہ عالم تھا کہ غزلوں تک کے کاغذ یاران طریقت لے بھاگے تو کیا پرومیسری نوٹ چھوڑ دیتے ۔ صغیر سن بچے کسکا گھٹا تہا تھے اب روتے ہو حشر تک رویا کرو ۔ سر پیٹا کرو ۔ کیا ہوتا ہے ۔

علم نجوم اور رمل کا کمال ۔

نجوم ہو کہ رمل بغیر زائچہ کام نہیں دیسکتا ۔ اور یہاں یہ عالم تہا کہ اطمینان اور یکسوئی تو دور ایک ہی صحبت میں شاعری شطرنج ۔ طب ۔ موسیقی ریاضی ۔ صنعت و حرفت وغیرہ کا مذاق رکھنے والے صف بستہ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں روئے سخن ایک کیطرف نہیں اور سائل کا جواب ہو کہ دیا جا رہا ہے

کبھی ایسا بھی ہوا کہ صرف سائل کی صورت دیکھ لی اور اجازت سوال نہیں تقویم سال میں سرسری طور پر ایک بار دیکھ لیتے تھے ۔

انکے رفیق قدیم شیخ عبدالکریم نے آنکھوں کی دیکھی باتیں لکھ کے مصنف آبحیات کو بھیجی تھیں جسکو وہ خود فرماتے ہیں کہ میں نے داخل دفتر کر دیا ۔ صرف ایک واقعہ لکھا کہ ایک دن کوئی غریب ہندو نہایت بیقرار و پریشان آیا اُس نے خانصاحب سے کہا کہ صاحب میں لُٹ گیا ۔ یہ اُس کا منہ دیکھنے لگے اور فرمایا بس خاموش رہو ۔ کیا تمہارا کچھ مال جاتا رہا ہے وہ گھبرا کے بوکھلاہٹ میں چھاتی پیٹ کے کہہ اٹھا حضرت کیا کہوں لُٹ گیا ۔

مومن خان پھر بولنے کو منع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو میں کہوں اُسے سنو۔ جو غلط ہو اُس سے انکار کر دینا۔ پھر پوچھا کہ زیور کے قسم سے تھا۔ وہ کہتا ہے صاحب ہاں عمر بھر کی کمائی تھی کہا کہ تمنے لیا ہے یا تمہاری بی بی نے۔ کوئی غیر تو چورانے نہیں آیا۔ اُسنے کہا میرا مال تھا اور بی بی کے پہننے کا زیور تھا ہم کیوں چوراتے یا وہ کیوں چھپاتی۔ ہنس کر فرمایا کہ کہیں رکھ کے بھول گئے ہو۔ مال باہر نہیں گیا اُسنے کہا صاحب سارا گھر ڈھونڈھ مارا کوئی جگہ باقی نہیں۔ کہا۔ جاؤ اور پھر دیکھو۔ وہ گیا اور پھر سارے گھر میں اچھی طرح دیکھ آیا۔ کہنے لگا حضرت میرا چھوٹا سا تو گھر ہے ایک ایک کونہ دیکھلیا کہیں پتہ نہیں۔ خانصاحب شطرنج کھیلنا چھوڑتے ہیں اور اسکے طرف توجہ کے ساتھ رجوع ہوتے ہیں اور کہتے ہیں تم غلط کہتے ہو۔ وہ کہتا ہے آپ چلکر خود تلاشی لے لیجئے میں تو ڈھونڈہ چکا یہ سنکر اُسکے۔ سارے گھر کا نقشہ بیان کرنا شروع کر دیا جیسے مومن اسکے گھر میں کھڑے ہوں بتایا کہ دیکھو۔ گھر میں جنوب کے رخ جو کوٹھری ہے اُس میں شمال کے طرف ایک لکڑی کا مچان ہے اُسکے اُوپر تمہارا مال موجود ہے وہ کہتا ہے پیر و مرشد اُس مچان کو تو میں نے تین بار چھانا ہے وہاں نہیں ملا فرمایا اُسی کے ایک کونے میں مال پڑا ہوا ہے غرض وہ پھر دوڑتا ہے اور جب روشنی جلا کے دیکھتا ہے تو ڈبا زیور کا جوں کا توں وہیں پاتا ہے اور خوش خوش آ کے خبر کرتا ہے کہ حکیم جی ہمارا مال مل گیا۔

کہئے یہ نجوم ہے یا کشف۔ حقیر عرش جب آپکی پوتی صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُنہنے اس قصہ کو بھی سُنایا نیز وہ یہ بھی کہتی تہیں کہ وہ عامل تھے۔ گنڈے تعویذ کی بھی اُن کے دہوم تھی پھر ارشاد فرمایا۔

کفر پر جبکہ ہے اسلام ازل سے غالب
آپ مٹ جائینگے مومن کے مٹانے والے

رمل کا کمال

شب کو سنتا اور قصہ انکا دراز ورنہ   احوالِ میر صاحب ہم تکو سب سناتے

خانصاحب کا دربار لگا ہوا ہے مختلف علوم و فنون کے شایق دامن طلب پھیلائے ہوئے بیٹھے ہیں ایک طرف حکیم سکھانند راقم بھی سودب بیٹھے ہیں۔ یہ ریل میں خانصاحب کے شاگرد ہیں۔ دیوار پر ایک چھپکلی نظر آتی ہے خانصاحب راقم کو فرماتے ہیں ہی ذرا دیکھنا یہ چھپکلی دیوار سے کبتک ہٹیگی وہ زور لگا کے کہتے ہیں حضور یہ ابھی جاتی ہے خانصاحب شطرنج کھیل رہے ہیں مگر مسکراتے ہیں اور دیوار کے طرف دیکھ کے حکم لگاتے ہیں واہ جب تک پورب سے اسکا جوڑا نہ آجائے کیونکر جائیگی۔ دیکھو اور پھر دیکھو۔ گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد بالاخانہ پر جہاں خانصاحب جلسہ جمائے بیٹھے ہیں ریشمی کپڑوں کے دو گٹھے لیے ہوئے ایک سوداگر آتا ہے (خانصاحب کو ریشمی کپڑوں سے ازلی ذوق تھا اور کمسے کم پاجامہ ریشمی ضرور پہنتے تھے) سوداگر مزدور کے سر سے جیوں ہی ایک گٹھا کپڑے کا پورب والے دروازے سے داخل ہو کر کمرے میں اُتارتا ہوگا گٹھے سے ایک چھپکلی پٹ سے گرتی ہے اور دوڑ کر دیوار والی چھپکلی سے جا ملتی ہے پھر دونوں چھپکلیاں مل ملا کے ایک طرف کا راستہ لیتی ہیں۔ راقم خانصاحب کا عالم تحیر میں منہ دیکھتے ہیں اور وہ مسکرا کے فرماتے ہیں۔ میاں ہنوز دلی دور ہے۔ تم چاہتے ہو شاعری[سلہ] کی طرح اسکو بھی حاصل کرلوں تو یہ مذاق نہیں۔

افسوس آج دلی خاک میں مل گئی۔ مرد سے مار! مگر ان واقعات کے بتانے والے نہ ملے۔ کہ ناظرین کی دلچسپی بڑھاتا۔ میں اطراف ہندوستان میں تحریک کرتے کرتے تھک گیا کہ ہی جن صاحبوں کو خانصاحب کے کمالات سے واقفیت ہو مجھے سرفراز فرمائیں مگر ہائے اس کے جواب دینے والے نہ رہے ہم سے بہت پہلے وہ کاروان چل بسا اور اُن کے نقش پا کو بھی سرسراور بگولوں سے

[سلہ] راقم۔ کا اک شعر سن لو اور اسی سے اُن کی شاعری کا انداز کرلو ؎

عدم سے کوچہ قاتل کی راہ ملحق ہے   گیا اُدہر جو گذر پھر ادہر نہیں آیا

مٹا ڈالا ؎

صورتیں آنکھوں نہیں جو تھیں مرثیوں کی ست گئیں
عرش انکا کس طرح نام و نشاں پیدا کروں

حلیہ اور وضع

سفید، قامت سرخ و سفید سبزی مایل سیب کا سا رنگ تھا (جو اکثر کشمیریوں میں پایا جاتا ہے) بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ لمبی لمبی پلکیں، پتلے پتلے ہونٹ۔ لمبی ستواں ناک۔ مسی آلود دانت۔ ہونٹوں پر پان کا لاکھا۔ ہلکی ہلکی مونچھیں خشخاشی داڑھی۔ بھرے بھرے بازو۔ پتلی کمر، چوڑا سینہ۔ لمبی لمبی انگلیاں۔ سر پر گھونگروالے لمبے لمبے بال زلفوں کی صورت میں پشت اور شانوں پر بکھرے ہوئے کچھ لٹیں پیشانی کے دونوں طرف کاکلوں کی شکل رکھتی تھیں۔ کان کے قریب تھوڑے سے بالوں کو موڑ کر زلفیں بنالیتے تھے۔ پیشانی بلند تھی مختصر یہ کہ آج بھی (امتہ الفاطمہ بیگم عرف صاحب جی) کے مزار سے انکی طرف کنایہ کرتی ہوئی یہ آواز آتی ہے کہ ؎

حسن سبز است بخط سبز مرا کرد اسیر دام ہمرنگ زمین بود گرفتار شدم

اس حسن و جمال کے آدمی بہت کم دیکھے جاتے ہیں اس پر وضعداری قیامت ڈھا رہی تھی اور یوں کہئے کہ ساری دلی میں یکتا تھے۔

بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا اسکے نیچے کرتا نہ ہوتا تھا۔ گلاب کا سا جسم انگرکھے کے پردے سے یوں دکھلائی دیتا تھا جیسے سفید شیشے میں سے احمر۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ اسمیں چھوٹا سا سنہری تعویذ۔ کاکریزی رنگ کے دوپٹے کو بل دیکر کمر میں لپیٹ لیتے تھے اور اسکے دونوں سرے سامنے پڑے رہتے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا خار پشت نقرئی اکثر ہوتا تھا۔ پاؤں میں عہد شباب تک سرخ گلبدن کا پاجامہ موہریوں سے کچھ تنگ اور اوپر سے ڈھیلا جیسا اب بھی کشمیری پہنتے ہیں چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

غریق گریۂ خونیں رہا نہ کر مومن — لباس یعنی پہنتے نہیں مسلمان سرخ

ادہر آپکے ایک بر سادہ پاجامہ بھی پہنتے تھے مگر نیفہ اُسکا سرخ ریشمی کپڑے کا ضرور ہوتا تھا۔ انگرکھے کی آستین آگے سے ایک بالشت کٹی ہوئی۔ اُسکو یا تو اُلٹ کے چڑہا لیتے تھے خواہ لٹکی ہوئی ہوتی تھیں۔ سر پر گلشن کی پنج گوشیا کی ٹوپی اُسکے کنارے پر ایک سفید ریشمی لیس۔ ٹوپی اتنی بڑی ہوتی تھی کہ سر پر اچھی طرح منڈھ کر آجاتی تھی اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال شیشے کے بال کی طرح صاف نمایاں ہوتے تھے۔ غرض یہ کہ نہایت خوش پوشاک اور نہایت جامہ زیب تھے۔ شعر پڑھتے وقت ٹوپی کو اوڑھا لیتے تھے اور گہونگر والے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے رہتے تھے۔

سید حیدر علی دہلوی۔ خواجہ عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی سے یہ اپنی آنکھوں کی دیکھی ہوئی بیان کرتے تھے کہ میرا گھر مومن خانصاحب کے گھر کے پاس تھا میں نے خانصاحب کو بہت دیکھا۔ ایسا شوقین آدمی دلّی میں نہ تھا جدہر سے وہ گذرتے تھے لوگ تصویر کی طرح اُنکو دیکھنے لگتے تھے۔ راہ میں جب وہ فکرِ شعر میں ہوتے تھے تو اُنکی اُنگلیوں کو حرکت رہتی تھی۔ اسی طرح ہمارے دیرینہ محترم مرزا انشا علی شہرت دہلوی جو کچھ دن مخزن کے بھی ایڈیٹر تھے فرماتے تھے کہ میں نے مومن کو اچھی طرح دیکھا اور صحبتیں اُٹھائی تھیں۔ اُنکو عطر اور پھولوں سے بہت شوق تھا۔ جس گلی سے وہ گزر جاتے تھے معطر ہو جاتی تھی۔ اور لوگ جان لیتے تھے کہ ہو نہ ہو مومن خاں ہیں عرصہ سے مرزا صاحب کے خطوط نہیں آئے۔ خدا رحم فرمائے۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ میں مومن کا بہت کچھ حال لکھ کے بھیجونگا۔ ہائے وہ محترم زمانہ اور متبرک ہستیاں خواب ہو گئیں ؎

تا نہ فہمیم کہ منزل گہ مقصود کجاست — اینقدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی کو خدا قائم رکھے جنکی بدولت مومن کی تصویر آج صفحۂ ہستی پر ہے۔ حضرات ناظرین اب میرے بیان کو پرانی تاریخوں سے مطابق

کر کے تصویر مومن سے ملا لیں۔ میری راست گوئی اور سخن فہمی کا پتہ چل جائیگا۔

غالباً ایسی ہی پاک صورتوں پر مولانا آسی سکندرپوری نے یہ فرمایا ہے کہ

وہ مصور تھا کوئی یا آپکا حسن شباب　　جسنے صورت دیکھ لی ایک پیکر تصویر تھا

اسکے علاوہ دہلی والوں کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ مرزا غالب ایک مرتبہ مزار مومن پر گئے تو بہت روئے اور بے اختیار یہ شعر فرمایا کہ

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں　　خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

رہائش کا امیرانہ انداز۔

سچ ہے بڑوں کی بڑی بات چیلوں کے کوچے میں خانصاحب کا آبائی مکان حکیم آغا جان کے چھتے کے سامنے تھا۔ بڑا سا دروازہ۔ اندر بہت وسیع صحن۔ اُسکے چاروں طرف عمارتیں دو طرف دو صحنچیاں۔ سامنے بڑے بڑے دالان پچھلے دالان کے اوپر کمرہ۔ سامنے کے دالان کی چھت کو کمرے کا صحن کر دیا تھا۔ منڈیر بہت چھوٹی رکھی تھی کہ نیچے کے حصے میں ہوا اور روشنی پہنچ سکے۔ ایک دالان میں چاندنی کا فرش تھا۔ اندر کے دالان کے بیچوں بیچ قالین بچھا ہوا۔ قالین پر گاؤ تکئے سے لگے ہوئے حکیم مومن خان اُسی لباس میں جسکا ابھی ذکر کیا گیا بیٹھے تھے۔ چاندی کا حقہ طشت میں سامنے ہوتا تھا اُنکے ارد گرد شہزادے۔ امیرزادے شعراء طبیب اہل نجوم۔ صنعت و حرفت کے شیدا۔ سوداگر۔ وغیرہ وغیرہ مودب رہا کرتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑے امیر کا دربار لگا ہوا ہے۔ ہائے کل کی باتیں کہانیاں ہو گئیں۔

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ　　سن رکھو تم فسانہ ہیں ہم لوگ

جس طرح مومن کے دیکھنے والے آج خاک نشین ہیں۔ کل اپنا بھی کسی تکیہ میں بچھونا ہوگا۔ مومن تو خوش قسمت تھے جنکا ایک صدی بعد ہم ماتم کرنے بیٹھے ہیں

یہاں تو اپنی بالین پر کوئی دو آنسو بہانے والا نہو گا۔ بدمذاقی سے میری تصنیف تک دیمک خوردہ ہو کے خاک میں مل جائیگی۔ دیکھو شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی کو جنہوں نے میر و سودا کے عہد میں آبرو پائی تھی آج پٹنہ میں اُنکے مزار تک کا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔ اُنکا دیوان تک ناقدردانی کے طاق میں پڑا ہے کچھ جز اُٹھا لے گئے۔

مومن کی شادی۔

مجکو تذکرہ طور رکلیم کا حوالہ دینے کی محتاجی نہیں نہ فراق صاحب کی منت کی ضرورت ہے اسلئے مومن کے خاندان والے مل گئے ہیں۔ چنانچہ آپکی پوتی صاحبہ اور آپکے نواسے فرماتے ہیں کہ اُنکی شادی میر محمد نصیر محمدی۔ رنج خلف میر کلو نبیرہ و سجادہ نشین خواجہ میر درد کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ چنانچہ آپکو اس خاندان سے کچھہ جائداد اور ایک حویلی بھی رہنے کو ملی تھی جسکو مومن خاں نے اپنی حیات میں اسلئے فروخت کردیا کہ اُنکو سسرالی مکان کی محتاجی نہ تھی۔ بہرحال مومن کی یہی ایک بی بی تہیں۔ اور انہیں کے بطن سے صاحبزادہ احمد نصیر خاں اور دو لڑکیاں ہوئیں۔ جنکا بالتفصیل ذکر آگے آئیگا۔

خواجہ محمد نصیر رنج کو سرسید احمد خان مرحوم نے بھی دیکھا تھا اور اُنکے نسبت لکھا ہے کہ وہ ایک صاف باطن درویش اور دہلی کے مشہور و معروف مشایخ سے تھے رنج مرحوم کے دو شعر بھی بطور یادگار درج کئے دیتا ہوں پھر موقع ملے نہ ملے۔

خط دیکھکر ادہر تو مرا دم اُلٹ گیا — قاصد اُدہر بدیدۂ پرنم اُلٹ گیا

دل یہ جسکے لئے پہلو میں نہاں رہتا ہے — یوں ستاتا ہے کہ اُسے بھی خفقان رہتا ہے

ناظرین گرچہ آگے بھی اس بحث کے سننے کو تیار رہیں مگر مختصر طور پر اک وقتی فیصلہ اسکا کردیں کہ اگر بقول آزاد۔ مومن و ہابی۔ یا بقول دیگران اگر مومن پٹھان ہوتے تو

انکی شادی خواجہ درد کے گھرانے میں انکی نواسی سے کیا ہو سکتی تھی۔ معاذ اللہ یہ وہم ہی تھا اور اسوقت کی خواجہ زادگی تھی کہ اگر انکو سلطنت بھی دے دی جاتی تو برادری کے باہر لڑکیوں کو جانے نہ دیتے۔ بلکہ ایسی صدہا نظیریں موجود ہیں کہ بادشاہوں نے اپنے گھر کی لڑکیاں محض فخر شرافت کیلئے انکے گھرانوں میں بیاہی ہیں۔ مختصر یہ کہ میں نے کچھ اس تاریخ کے اندر لکھا ہے یہ فرق صحیح ہے اور یوں اعتراض کرنے کو زبان خلق میرے قابو میں نہیں مگر وہ دریائے اشک چشم سے جس آن بہہ گیا ہو کوشش کیجیو کہ عرش کا ایوان ہلگیا

مومن کا تعشق اور شاعری کی برکت

دن بھی دراز رات بھی کیوں ہے فراق یار میں

کاہے سے فرق آگیا گردش روزگار میں

جناب خانصاحب گستاخی معاف۔ فرق ورق خاک نہیں آیا ہے آپ مولوی آدمی ہیں آپ کیا جانیں کہ عشق کیا بلا ہے اور کیا کیا آفتیں یہ کمبخت ڈھاتا ہے آپکو خود اپنی خبر نہیں کہ عشق کا جادو آپ پر چل گیا ہے آپ بلاؤں میں گھر گئے ہیں۔ آفتوں میں پھنس گئے ہیں اور محض اسی سبب سے آپ کے کاٹے نہ دن کٹتا ہے نہ رات کٹتی ہے اور گھر سے نکلتے اور کوچہ و بازار کے طرف جاتے۔ اور شاعری میں رات دن غرق رہتے تب سمجھیگا کہ گردش روزگار پر کسی اور کا نہیں بلکہ آپ کے ہی محبت کا اثر پڑگیا ہے یوں تو آپ ازل سے عشق کے بندے ہیں مگر خدا بھلا کرے صاحب جی کا جن کی محبت اسیر بھی بالاتر نظر آتی ہے یعنی ؎

لیکے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے | دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

ناظرین گلشن بیخار مولفہ نواب مصطفٰے خان شیفتہ ملاحظہ فرمائیں۔ گو واقعات اسمیں بالتفصیل تو نہیں مگر مختصراً کچھ ہیں۔ اور ایک شاگرد داد کو بہ نظر رکھ کے جو لکھ سکتا ہے، وہ لکھا ہے ـــ

صاحب معروف بہ صاحب جی بنام امۃ الفاطمہ بیگم بتقریب بدا وا
با مومن خان کار ش افتاد ما حصے چند کار باد دو وا بود مثنوی عشق
نام کہ از خان مغفرے الیہ است شرح نسخہ و حسن و جمال ہمان موزوں
قد است۔

اب حضرت خان موصوف اپنی آن بان سے جسکی تصویر اوپر دکہائی جا چکی ہے دلی
کے ایک کوچہ سے گذرتے ہیں اور وہ اپنے کوٹھے سے انکو دیکھ کے کہتی ہیں کہ ع
کلیجہ تہام لو کہڑکی کا پردہ ہم اُٹھاتے ہیں ہٗ مومن کی نگاہ اُٹھتی ہے اور وہ اپنی نرگسی آنکھوں
کے جادو سے انکو مسخر کر لیتی ہیں۔ خانصاحب کوچہ عشق سے نا آشنا ہیں ہکا بکا
ہو کے کہتے ہیں کہ ؎

انگڑائی لیکے اُسنے مجہہ پر خمار ڈالا   کافر کی اس ادا نے بس مجکو مار ڈالا

وہ عیار اسکو سنتی اور عیاری سے چپ لگا جاتی ہو۔ خانصاحب اپنے کلیجے پر اک
داغ لئے ہوئے گہر پلٹے ہیں چونکہ غایت مہذب ہیں چپ لگ گئی ہو گا و تکیہ سے لگے ہوئے
سوچ رہے ہیں کہ یہ ہوا کیا۔ کوئی راہ اس سے ملنے کی نکالنی چاہیئے۔ اور کسیکو ہمراز
بنانا چاہتے یہ بہی اُنکے دلمیں کہٹکا ہو کہ عجب نہیں یہ وہ بلا سے سب درماں ہو جو جہہ
دن آگے اپنے درماں کو میرے یہاں ڈولی میں آئی تہی کچہہ ہی روز کے بعد
ضبط جواب دیتا ہو۔ اور زبردستی دل کہینچے ہوئے پہر اُسی کوچہ میں لے جاتا ہو۔ وہ باہر
کہڑی ہوئی محوِ نظارہ نظر آتی ہو اور انکو دیکھ کے کہتی ہو کہ آہ ؎

بڑا اندیشہ ہو دیکھیں کدہر فرقت میں جاتے ہین   خدا پہلے بلاتا ہو کہ وہ پہلے بلاتے ہین

خانصاحب ہوش میں اب نہیں ہیں قریب تہا کہ گر پڑیں۔ اک شخص نے ہاتہ تہام
لیا اور انکو اک طرف لے چلا۔ اُدہر دوسروں کو سنا کے وہ یہ کہتی ہو کہ ؎

ہو گئی دور رونے کی الفت میں کیا حالت ابہی   مومن وحشی کو دیکھا اسطرف سے جاتے بہی

مومن ابھی کچھ زیادہ دور نہیں گئے ہیں یہ آواز بھی اُنکے کانوں میں آگئی۔ اب جو گھر پلٹ کے آتے ہیں تو یہاں آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھتے اور کہتے ہیں۔ لے واہ میں تو اچھا خاصہ ہُوں۔ کوئی آثار ہم میں وحشیوں کے سے نہیں۔ پھر اُسنے مجھے وحشی کیوں کہا اب اسکا جواب کون دے۔ غرض یہی قصے پیش ہیں اور تنہائی میں دل سے راز و نیاز کی باتیں ہوا کرتی ہیں کہ ایک شریف صورت آدمی (اور وہی آدمی جسنے ابھی ابھی اُنکو گرنے سے سنبھالا تھا) آتا ہے اور بڑی متانت سے سلام کرکے دست بستہ عرض کرتا ہے کہ حکیم جی اک مریضہ یہاں لانے کے قابل نہیں ذرا چلکر اُسکو دیکھ لیں حکیم صاحب کو کیا خبر کہ یہ وہی مریضہ ہے جنہوں نے مجکو بیمار کر رکھا ہے۔ یہ بیچارے تشریف لے جاتے ہیں جب یہ اسکے ساتھ کوٹھے پر پہونچتے ہیں تو پہلے یہ غور کرتے ہیں کہ یہ ہم کہاں آتے ہیں۔ ابھی یہ سلسلہ خیال ناتمام سا ہے کہ نبض دیکھنے کی نوبت آتی ہے۔ نبض میں شوخی شرارت کے سوا کسی مرض کا پتہ نہیں چلتا۔ اب یہ سمجھتے ہیں کہ ہونہو یہ اُسی عیار کی نبض ہے ادہر اسکو پانا تھا کہ دل ہے دلکو راہ ہوتی ہے وہ جھٹ ہاتھ جھٹک کے کھینچ لیتی ہے۔ اور وہ آدمی جو انکو لے گیا تھا غائب ہو جاتا ہے اب انمیں اور صاحب جی میں جو باتیں ہوتی ہیں اس کو وہ مثنوی عشق میں یوں لکھتے ہیں کہ ؎

اس غزل سے اُسے آگا کیا ہاتھ کو ہاتھ جھٹک کھینچ لیا

ہے یہ بیچارہ تو آپ ہی بیمار زرد ہے رخ سے عیاں ہے آزار

وغیرہ وغیرہ۔ یہ تو اُدھر کا آوازہ ہے۔ ادہر مومن کہتے ہیں کہ ؎

کیا انکا دست دلآرام سے ہاتھ دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ

غرض ساری کی ساری مثنوی ایسی آب ورنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اسکا ایک ایک شعر اہل محبت کو عالم محویت و تحیر میں ڈال دیتا ہے اب حکیم جی کو

یہ حکم دیا گیا کہ روزانہ آ کے نبض دیکھ جایا کرو۔ چنانچہ سرکار میں یہ سلام کو روزانہ جاتے تھے۔ ابھی چند ہی دن سلسلہ آنے جانے کا رہا تھا کہ بے تکلفی ہو گئی اور اب تو ؎

یہاں تھا بیٹھنا مشکل وہاں سے اٹھنا مشکل ہے
کہ پاؤں کے انگوٹھے سے مراد ان دباتے ہیں

یعنی صاحب جی نے پردہ اٹھا دیا مگر ساتھ ہی ساتھ اُسکے مومن پر اُنکا رعب حسن پڑا ہوا تھا دس سوال اُدہر سے ہوتے تھے تو دبی زبان سے یہ ایک آدہ کا جواب دے دیتے تھے۔ مثنوی کا ہر شعر تو موقع موقع سے لانا طوالت ہے مگر مومن ایک شعر میں جو عشق مجازی کے جذبات کی جو تصویر کھینچتے ہیں اسکو دیکھ لو۔ یعنی ؎

کہا کچھ بات کہوں کہہ نہ سکا
چاہا خاموش رہوں رہ نہ سکا

اللہ اللہ کیا کشمکش ہے اور کیا دم گھٹنے کی جگہ ہے یعنی چاہا کہ اظہار حال کروں مگر نہ کر سکا پھر یہ چاہا کہ چپ رہوں مگر چپ بھی رہا نہ گیا۔ اب عشق کے تھیٹر کا وہ پردہ اٹھتا ہے جسمیں عاشق و معشوق آمنے سامنے بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور صرف ایک دوسرے کو نگاہ یاس سے دیکھ کے رو رہا ہے۔ مومن۔

کیا نے ڈہب سے ملاقات ہوئی
کہ نہ کچھ بولی نہ کچھ بات ہوئی

دل کے حسرت زدگان بیکس
دور بیٹھے ہوئے روتے ہیں بس

کیا سلیقہ اور ادب آموزی عشق کی ہے۔ کہ ملکے بیٹھے ہوتے ہیں اور ذرا دور دور بھی ہیں۔ آج وہ حضرات جو میر حسن مرحوم کی مثنوی کے انداز پر مرتے ہیں دیکھ لیں کہ ہم کا۔ دنیا کسے سنام نہ کرد۔ کیا ان شعروں میں نیچرل جذبات نہیں ہیں؟ اب رونا تھمتا ہے لب پر آہ آجاتی ہے یعنی ؎

خوں فشاں لب پہ وہ آہیں باہم
حسرت آلودنگاہیں باہم

تو اب اس طلسم کا وہ دردناک پردہ اٹھتا ہے جسمیں تمہیں اک عالم یاس کے

سو ایسا بھی اتفاق نہیں آئیگا یعنی اب صاحب جی نے ارادہ کر لیا ہو کہ مومن کو امید موہوم پر کیوں رکھیے صاف جواب دے دیجیے اور کہہ دیجیے کہ افشائے راز ہوگیا اب میرے اقربا مجھے دلی سے دوسری جگہ لے جانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ سمجھا کے فرماتی ہیں کہ مومن خان ۔

خیر رہنا ہوا اب تک اپنا اب وطن تم کو مبارک اپنا
تم رہو خوش کسی جاناں کے ساتھ ہم چلے حسرت و ارماں کے ساتھ
کام دل رنج و بلا کو سونپا تم کو لو۔ ہم نے خدا کو سونپا

اب وقت نہیں کہ زیادہ گفتگو کروں۔ اسی عرصہ میں کسی کے پاؤں کی آہٹ ملتی ہے اور شاید یہ وہی شخص ہے جو مومن کو ایک روز بلانے گیا تھا۔ غرض اک ہلچل سی دل میں پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ـــ

کہہ کے یہ اٹھ گئی جی کھوتی ہوئی ہچکیاں لیتی ہوئی روتی ہوئی

ادھر صاحب جی کا ہٹنا تھا کہ مومن بھی روتے ہوئے گھر چلے آتے ہیں۔ اور تھوڑی دیر بعد انکو اپنے علم نجوم سے پتہ لگتا ہے کہ وہ دلی سے روانہ ہوگئیں اب کدھر گئیں کیا ہو تم اس راز کو مقدر کھلنے نہیں دیتا۔ دل یہ تقاضہ کر رہا ہے کہ بی بی لڑکوں کو چھوڑ اور گھر سے نکل ننگ و ناموس کا غم نہ کر زمانہ جو چاہے کہے ؎

بندۂ عشق شوی ترک نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

چنانچہ خانصاحب نے شہر و بیابان کی خاک بھی چھانی اور ناکام ہو کے واپس بھی ہو گئے یہاں تک تو مثنوی سے پتہ چلتا ہے مگر یہیں پر دو سوال بھی پیدا ہوتے ہیں ۱۔ صاحب جی اگر دہلی واپس نہ ہوئیں تو مومن نے انکی غزلوں پر اصلاح کب دی جسکا ذکر شیفتہ نے کیا ہے ۲۔ اگر انکا انتقال کرنا تسلیم نہیں کیا جاتا تو کلیات مومن

ہیں یہ نوحے کیسے ہیں۔ اسلئے کہ مومن کی بی بی کا انتقال مومن کے بہت بعد ہوا
اب یہ کہ مومن کسی اور پر عاشق ہوئے اور اسکی موت کے متعلق یہ نوحے ہیں یہ
محض تطویل لاطایل ہے۔ عشق ہمیشہ آدمی کو ایک کا ہوا ہے اور ہوتا آیا ہے اسلئے اگرچہ
مثنوی سے میں اسکا ثبوت نہیں دیسکتا مگر جیسا کہ سنا گیا۔ قرین قیاس ہے کہ
صاحب جی دلی واپس آئیں اور یہیں انکا انتقال ہوا۔ بہرحال جو کچھ بھی ہوا اس
تعقد نے میرے دیرینہ زخم کو تازہ کر دیا ہے

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیمکش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

میں خود اس زخم کی تکلیف سے آشنا ہوں۔ اور ضمیمہ کلیات عرش غیر مطبوعہ
سے اسکا پتہ چلیگا ہے

اے عرش مجکو عشق نے بخشا یہ مرتبہ
دیکھو ہے نظم غیر میں ایسا اثر کہاں

مومن کی استغنائی

انکی طبیعت نہایت غیور اور بے پرواواقع ہوئی تھی۔ بعد امرائے روزگار نے
چاہا کہ یہ درباری پابندی اختیار کریں مگر اور انکا دربار کیا جب انہوں نے
بادشاہ وقت کی مصاحبت اور پابندی پسند نہ کی۔ حالانکہ ذوق تو ذوق غالب
سا آزاد منش بھی اس معاملہ میں معذور رہتا۔
مومن کو والئے رامپور۔ والئے ٹونک۔ والئے بھوپال۔ والئے جہانگیرآباد وغیرہ نے اپنے
دوستانہ مراسم کے جال میں بہت پھنسانا چاہا مہاراجہ کپورتھلہ نے ساڑھے تین سو روپیہ
ماہوار پر طلب کیا مگر وہاں بھی نہ گئے زاد راہ تک واپس کرکے یہ صاف جواب لکھدیا
کہ جس دربار کا ایک ادنے گویا ساڑھے تین سو روپیہ پاتا ہو وہاں میں اُسی تنخواہ
میں نہیں آسکتا۔ سر ٹامسن لفٹننٹ گورنر پنجاب نے سو روپیہ مہینہ مقرر کئے صیغہ تعلیم

میں انکو دہلی سے ساتھ لے جانا چاہا مگر انکو بھی جواب دیا کہ دلّی ابھی اتنی سستی نہیں کہ اسکو سو روپیہ میں مومن بیچ ڈالے۔ بقول میر ؎

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب | رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اسکو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا | ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

غرض یہی وہ اسباب ہیں کہ مومن اور شعرائے معروف کی طرح عالم میں مشہور نہ ہو سکے ابھی تاریخ کے صفحات موجود ہیں دیکھ لو جس نے مقبولیت اور شہرت عام پائی ہے امرا کی مصاحبت کے بدولت پائی ہے۔ صرف اپنے پاؤں پر کھڑے رہنے والوں میں شمع کی طرح اگر کوئی ہے تو وہ مومن یا چند اور حضرات ورنہ میر۔ سودا۔ سوز۔ میر حسن۔ سید انشا۔ میر انیس۔ مرزا دبیر۔ اسیر۔ ذوق۔ ناسخ۔ آتش۔ خلیق۔ جرأت۔ غالب۔ امیر۔ جلال۔ داغ۔ تسلیم۔ امانت وغیرہ وغیرہ سبھوں کو کم و بیش درباروں کی پابندی ضرور رہی ہے۔ اور سب نے امرا کی حجت سرائی میں بسر کی ہے۔ اب جو حضرات کہ مومن کی سی آزاد طبیعت لائے تھے انکا انجام صرف یہ ہوا کہ اپنے کمالات کے برابر بھی شہرت نہ پا سکے اسکی نظیریں بھی چند نام پیش کئے دیتا ہوں۔ مظہر جان جاناں۔ آبرو۔ شاہ دیر و میر۔ طپش۔ شاہ حاتم۔ مولانا شمشاد۔ امید مرحوم۔ خورشید۔ خواجہ میر درد وغیرہ وغیرہ۔ مومن کے قصیدوں کی طرف نظر ڈالو تو عمر بھر میں دو قصاید امرا کی طرف لکھ کے منسوب کئے ہیں ایک راجہ اجیت سنگھ والئے پٹیالہ کے نام پر ہے جنہوں نے رستہ سے مومن کو بلوا کے قدر دانی کی۔ اور ہاتھی کے عطیہ کے ساتھ رخصت کیا۔ مومن نے ہاتھی کے انعام کا بار اپنے سر لینا نہ چاہا اور یہ کہہ کے ٹالا کہ حضور میں غریب آدمی ہوں ہاتھی کو کہاں سے کھلاؤنگا۔ راجہ صاحب نے ایک ہزار سو روپیہ بھی دے کہ لو یہ ہاتھی کھائیگا۔ غرض مجبورا منظور کرنا پڑا۔

اور بہ اقتضائے تہذیب انعام کے بعد اُنکو محض اس خیال سے قصیدہ پیش کرنا پڑیگا کہ راجہ دلمیں بھی کہیگا کہ آئے دن کے قصیدے پر ذوق کو دربار شاہی سے ایک ٹوٹا ٹکا کبھی نہ ملا اور میں نے بے طلب ہاتھی انعام میں دیا تو مومن نے ایک رباعی تک میری شان میں نہ لکھی۔

دوسرا قصیدہ نواب وزیر خان والئے ٹونک کے نام کا ہے۔ جو دوستانہ پکڑ کے اپنے یہاں لے گئے تھے اور جنہوں نے بڑا تپاک کیا مجبوراً اُس شکریہ میں قصیدہ لکھا۔

مختصر یہ ہو کہ اگر مومن اپنے معاصرین ہم عہد کے راستے کو اختیار کرتے تو آج اُن کا دیوان مختلف ولایتوں میں زر و جواہر سے تولا گیا ہوتا۔ مگر کوئی کیسکی طبیعت اور دل کے اطمینان کو کیا کرے۔

تلمذ

کہا جاتا ہو کہ ابتدائی چند غزلیں شاہ نصیر مرحوم کو بنظر اصلاح دکھائی تھیں پھر وہ سلسلہ کچھ سمجھکے بند کر دیا۔ قرینہ غالب ہو کہ اپنے کو شاہ نصیر کے رنگ سے بہت دُور پایا۔ اور دیکھا کہ ہونے کو تو وہ اُستاد کیا اُستادگر ہیں اور سنگلاخ زمینوں کے بادشاہ ہیں مگر آہ آہ اور واہ واہ میں فرق ہو۔ ذیل کے چند شعروں ہی سے اسکا فیصلہ کیے دیتا ہوں دُور کیوں جاؤں۔

نصیر

سنگ وحشت ہے رو دیوار فتادہ کو دیکھ ۔۔۔ ہاتھ ملتی ہے پتھور کے محل کی ہی

حاشیہ: آزاد کی تو نہ پوچھیے۔ وہ تو صفحہ ۳۴۴ میں جہاں ذوق کو مومن کی دیکھا دیکھی نجوم علم موسیقی اور طب وغیرہ کا بھی ماہر لکھا ہے صفحہ ۴۴۴ میں یہ بھی لکھ گئے کہ صحت پانی کے قصیدہ کے صلہ میں بادشاہ نے ذوق کو خطاب خاقانی ہند دیا ایک ہاتھی مع حوضہ نقرئی دیا۔ شاید دیا ہوگا اسکی کہیں سند کر نہیں ملتا ہے ... خانہ خراب ... مسجدیں ... کیا فائدہ تعمیر سے

خیالِ زلفِ دوتا میں نصیر پیٹا کر — گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

مومن سے

سرگرمِ مدحِ غیر دمِ شعلہ زن سے ہے — دوزخ کو کیا جلن ہے دلکی جلن سے ہے
مرا خون کیا بارِ گردن ہوا — کہ پیچیں وہ دورِ گردن سے ہے

بہ بین تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا۔ جوڑا اُستاد شاگرد کا ایسا تو ہو جیسا کہ

منیر شکوہ آبادی اور میر علی اوسط رشک لکھنوی کا ہے۔

رشک سے ٹوٹینگے مرغانِ فلک کے بازو تک — جلنبش موجِ ہوا زنجیرِ پا ہو جائیگی
بھیک مانگیگے گا ہر اک دیا ہو گئے تم اگر — کشتیٔ ملاح کچکول گدا ہو جائیگی

منیر سے شادی کروں عروسِ مضامیں نور سے — نکلے برات کو چینِ بیت المعمور سے
اتنا گیا میں جوش جنوں کے وفور سے — پتا جہاں فلک نظر آتا ہو دور سے

بہرحال ایک ہی دو غزل کی اصلاح تھی مگر نصیر مومن کے استاد تھے۔ اور عمر بھر یہ انکو ادب کے ساتھ یاد کرتے رہے۔ چنانچہ ہیں نے سلسلہ شاعری ہیں بھی اسی کو قایم رکھا ہے

ہو نہ بیتابِ غمِ ہجر بتا نہیں مومن — دیکھ دل دو نہیں بس بفضلِ خدا ہوتا ہے

معاصرین

میر صاحب زمانہ نازک ہے — دونوں ہاتھوں سنبھالئے پگڑی

یوں تو اُس وقت بہتیرے اساتذہ سلف نیز ذوق بھی موجود تھے۔ مگر کہنے والے یہی کہتے رہے کہ وہ مشاعرہ کیا جسمیں غالب و مومن نہوں۔ ہر چند مومن کا کلام غالب سے بدرجہا سخت تھا مگر رشید ابان مشکل پسندی صرف غالب ہی کو مومن کا شریکِ غالب جانتے تھے۔ مرزا صاحب تو امراکے کہنے سننے سے شراب میں گلاب ڈال بھی دیتے تھے مگر مومن تو مٹے دو آتشہ میں پانی ملانا بھی گناہ جانتے تھے

مرزا بھی کہ ادا شناس تھے اُنکی نازک خیالی کو پسند فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ بیشک رنگین بیانوں کو سادگی زیبا نہیں ہے

زندہ وہی ہیں جو کہ ہیں تم پر مرے ہوئے — باقی جو ہیں سو قبر میں مردے گڑے ہوئے

غرض ذوق تو فیضانِ شوق و نصیر سے لکھنؤ کے عطر مجموعہ بن گئے تھے۔ مگر مومن نے ازل سے جس راستے کو پکڑا تھا اُسی پر رہے اور غالب ہمیشہ اُنکے ہمسفر رہے۔ اور دونوں میں کچھ ایسی دانت کاٹی روٹی تھی کہ ہمعصروں کی طرح کبھی آپس میں نہ جھگڑے۔[1] غالب سے جب کسی نے پوچھا کہ دلی میں آج شاعر کون ہے تو یہی کہا کہ میں اور مومن۔ مومن کے کسی شعر تک جب کوئی نہ پہونچ سکا تو انہوں نے یہی کہا کہ اس کا مطلب غالب سے پوچھو۔ چنانچہ بزم مومن و غالب میں کسی نے ذوق کو کبھی نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ ان دونوں سے کھٹکتے رہے۔ اگر کسی مشاعرہ عام میں شرکت اور یکجائی کی نوبت بھی آتی تو وہ ہمیشہ محجوب سے نظر آتے تھے۔ ہاں قلعہ کی دیوار کے اندر تقیم شہر سے بھی دو چار ہاتھ زیادہ پھاند لیتے تھے۔

سفر۔ خانصاحب کا کوئی سفر تحصیل زر کے لئے نہیں ہوا۔ بلکہ وہی جذباتِ عشق جب شدت پر تھے اور محرومیوں سے دم گھبرا گیا تھا تو گھر چھوڑ کے چند روز کیلئے نکلے تھے۔ یہاں تک کے رام پور، سہسوان، بدایوں، جہانگیر آباد، ٹونک، سہانپور تک گئے۔ مگر جی نہ بہلا تو پھر گھر واپس ہوگئے۔ کسی کسی سفر کا ذکر کلیات میں

[1] اس رابطہ کو انکے یادگاروں نے بھی قایم رکھا۔ چند سال ہوئے کہ حسرت موہانی نے علیگڈھ میں جو مشاعرہ کیا تھا اسمیں غالب کے نام لیوا میر مہدی مجروح اور مومن کی یادگاروں میں تسلیم شریک کئے گئے تھے ان دونوں میں کچھ ایسی محبت دیکھی گئی جو اس زمانہ کے اپنے بھائیوں میں بھی نظر نہیں آتی۔ تسلیم نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ

غنیمت جان اے تسلیم دو اک ہمسے بیٹھے ہیں — کہ یہ لطفِ سخن حسنِ بیاں اپنی زبان تک ہے

بھی کیا ہے ؎

دلی سے رام پور سے لایا جنونِ عشق
ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

سہسوان کا سفر صاحب جی کی تلاش میں تھا جسکا ثبوت دوسرے شعر سے ہوتا ہے

چھوڑ دلی کو سہسوان آیا
ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں
مجھے پہونچا دو میر صاحب تک
کہ غلام گریز پا ہوں میں

بدایوں میں مجھے جوشِ جنوں لایا دلی سے
یہ کیونکر چارۂ پندِ خردمنداں ہوش آیا

ہاں آج یہ بتانا دشوار ہے کہ ان شہروں میں کس کس کے یہاں ٹھہرے پھر بھی بعض مقامات کا پتہ چلا ہے۔ جو درج کرتا ہوں۔ رامپور میں نواب احمد سعید خاں کی مسند نشینی کے موقع پر بلائے گئے تھے۔ جہانگیر آباد میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے یہاں کہ ہمراز بھی تھے اکثر گئے۔ سہسوان میں اپنے ہمراز دوست حکیم منظر علی کے یہاں کہ وہاں کے رئیس تھے تشریف لے گئے تھے۔ ان حکیم صاحب کے صاحبزادے حکیم منظر علی صاحب لشکرِ گوالیار میں وکیل ہیں وہ فرماتے ہیں کہ خانصاحب نے چند دن کے قیام میں اک تصنیف بھی کی تھی۔ چنانچہ اسکا ذکر آگے آئے گا بقیہ راز سے وہ بیخبر ہیں۔

بیعت اور عقاید

کلکتہ کا وہ عظیم الشان مشاعرہ مجکو عمر بھر نہ بھولیگا جسکو میری خاطر سے چند سال ہوئے خان بہادر شمس العلما مولانا محمد یوسف صاحب رنجور عظیم آبادی چیف مولوی بورڈ اوف دی اکزمنرس نے منعقد کیا تھا اسمیں تقریباً چھ سو صرف شعرا تھے اور پچاسوں کرسیاں یورپین اور بہت سے شہر کی بڑی بڑی ہستیوں کی تھیں ایسی جماعت میں اک امتیازی کرسی۔ ڈاکٹر آیت اللہ بسمل عظیم آبادی ایم۔ بی۔ سی ایم۔ کی بھی تھی۔

جو وضع اور صورت سے بے فرق یورپین[سلہ] معلوم ہوتے تھے۔ کوئی نوّے ۹۰ برس کی عمر ہوگی آپکے والد اور مومن کی دوستی تھی انکے ساتھ زمانہ طفولیت میں آپنے مومن کو دیکھا تھا آپکے والد بھی مومن کی طرح حضرت علامہ سید احمد بریلوی رح کے مرید تھے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے کہ میں نے مومن کی زبان سے یہ شعر سنا ہے جو حضرت صاحب کے طرف منسوب ہے۔ مولانا سید احمد بریلوی حضرت صاحب کے نام سے مشہور تھے مومن اپنے پیر کے طرف رخ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ؎

زمانہ مہدیِ موعود کا پایا اگر مومن　　تو سب سے پہلے کہیو تو سلام پاک حضرت کا

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ الزامِ وہابیت مومن پر غلط ہے اب یہ کہ اُن پر یہ آوازہ کیوں ہوا اُسکا سبب وہ یہ فرماتے ہیں کہ مومن کے قلم نے خرقہ پوشانِ بے بہرہ کیطرف اشارہ کرتے ہوئے یہ رباعیاں لکھیں تو اُسوقت کے مشایخ جو اپنے مریدوں سے سجدہ تک حلال ٹھرائے ہوئے تھے بگڑ گئے اور دیکھا کہ یہ شخص ڈھولک ستار اور قوالی کو بند کرا دیگا۔ اور مُریدآباد سے اک ٹکا بھی نہ ملیگا۔ اس لئے بہتر ہے کہ لوگوں کو اسکے طرف سے برگشتہ کردو ورنہ مومن اور اُنکا سارا خاندان حنفی مسلک تھا خدائی کا دعوٰے کرنے والے وہ رباعیاں سن لیں۔

مومن ہے اگرچہ سب اُسی کا ظہور　　توحیدِ وجودی کا نہ کرنا مذکور
یعنی کہ بنائے ہیں خدا نے بندے　　بندے کو خدا بنائے کس کا مقدور

سلہ برسوں ولایت میں رہتے پر بھی مذاق آپکا اسقدر سلیم ہو سہ شنا ور رابطہ الفت کے ہم ہیں کہ ہمارے بحر کا ساحل نہیں ہے یا اسی مشاعرہ میں خاکسار نے حضور نواب مرشدآباد کو بھی دیکھا تھا بڑے زبردست محقق تھے یہ شعر اُنکا خاکسار کے طرف منسوب ہے سہ نہ آج عرش پہ کیوں ہو دماغِ کلکتہ کہ جنابِ عشق گیا ہے یہاں ہیں آئے ہوئے مجھے ذکر اس مشاعرہ کا انگریزی اُردو اخبارات میں بھی ہو چکا ہے ناظرین دیکھ لیں۔

مومن لازم ہے وضع مرغوب بنے ۔۔۔ جو رنگ ہو آدمی خوش اسلوب بنے
کیا خرقہ و عمامہ ہے اللہ اللہ ۔۔۔ جب شکل بگڑ گئی تو تم خوب بنے

وہابی نہ ہونے کے ثبوت میں اک تخمیس بھی ہے۔ یعنی جن حضرات کو وہابیت کا غلو ہے وہ نعوذ باللہ یہ بھی کہتے ہیں کہ انسان کثرت ریاضت و عبادت سے نبی ہو سکتا ہے۔ نبی آخر الزمان یعنی حیہ۔ قدسی کے اشعار پر مصرعے ہیں ؎

ہوں تو عاشق مگر اطلاق یہ ہے بے ادبی ۔۔۔ ہیں غلام اور وہ صاحب ہیں امت وہ نبی
یا نبی یک نگہ لطف بہ امی و ابی ۔۔۔ مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جان بست فدائے چہ عجب خوش لقبی

اسکے علاوہ صحابہ کرام کی مدح میں قصاید موجود ہیں۔ اب اس پر بھی وہ وہابی سمجھے جائیں تو اور بات ہے سید احمد صاحب نامی ولی اللہ سے گذرے ہیں کلکتہ میں آپ سے یہ کرامت ظاہر ہوئی کہ یک حلقہ میں تین سَو مریدوں کو ایک نالہ اللہ ہے میں علم ظاہری و باطنی کے منازل طے کرا کے واصل حق کر دیا۔ اسکے شاہد حضرت مولانا قاضی نور محمد صاحب چشتی ہیں جو چلّی قبر دھلے کے رہنے والے تھے۔ سید صاحب کا اک ادنیٰ رتبہ یہ تھا کہ جب یہ گھوڑے پر سوار رہتے تھے تو حضرت علامہ مولانا محمد اسمٰعیل رح سر پہ گھانس کا ٹوکرا لیکے انکے پیچھے پیچھے ہوتے تھے۔ کیا دنیا کے پردے میں کسی وہابی کو یہ شرف حاصل ہوا۔ مومن کے پیر کا مرتبہ آنر دکھیا جائیں۔ بڑے بڑے لوگ اور بالخصوص علما انکے مرید تھے جنمیں مولانا محمد اسمٰعیل شہید بھی تھے۔ مومن خود کوئی جاہل آدمی نہ تھے کہ سید صاحب کے ہاتھ پہ بیعت کر لی۔ اور اک وہابی کے وسیلہ کو سبب نجات قرار دیا ؎

فلک۔ کیا چودھویں کا چاند تو مجکو دکھاتا ہے
ہم ایسے طشت میں اک مہ جبیں کا منہ دھولاتے ہیں

طرز غزل خوانی۔

چونکہ یہ علمِ موسیقی کے بھی ماہر تھے اُسپر عاشق مزاجی مزید برآں تھی یہ سبب تھا کہ مشاعروں میں غزلیں ترنم کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ اواز بہت دردناک تھی غزل پڑھنے کیوقت انگلیونکی کنگھی زلفوں میں چلتی رہتی تھی۔ جب شعر کوئی گرم ہوتا تھا اور داد مناسب ملتی تھی تو حرکت انگلیونکی بڑھ جاتی تھی اہلِ مشاعرہ وجد کرنے لگتے تھے۔ اور نرم دل رو پڑتے تھے۔ اسکی چشم دید تصدیق آزاد نے بھی کی ہے انہوں نے بھی نسیم دہلوی اور شہزادہ قیصر کے مشاعرہ میں اُنکو سنا تھا مختصر یہ کہ ترنم کیساتھ مشاعروں میں پڑھنے کے یہ موجد گذرے جسکو اب بقول شمشاد مرحوم لوگوں نے یہانتک بگاڑ ڈالا کہ ساز کے ساتھ کہیں کہیں مروج ہے اور بعض حضرات نے پاؤں میں گھنگرو باندہ کے ناچنا شروع کر دیا ہے اور ناک پے جان صاحب بجنی گو کیطرح اُنگلی بھی رکھنے لگے ہیں۔ یہ زمانہ کی بدتری۔ غالب اس عذاب سے پاک تھے وہ خود اور اُنکے بعض نام لیوا تحت اللفظ کیطرح بہ آواز بلند پڑھتے تھے۔ اور آج بھی پڑھتے ہیں۔

اب اُس تحت اللفظ کیصورت ملاحظہ ہو کہ غالب کو تو بندے نے نہیں دیکھا ہاں اُنکے اک شاگرد شوخی رامپوری کو دیکھا اور سُنا تھا یہ گیا میں برابر آتے تھے۔ چنانچہ مطلب تو نہیں عرض کر سکتا مگر اُنکا ایک مطلع یاد ہے

شامیانہ جو مرے دل کی صفائی ہوتی　　دہوپ چھن چھن کے مری قبر پہ آئی ہوتی

پڑھنے کا اُنکے یہ عالم تھا کہ بہادوں میں بادل گرج رہا ہو۔ اپنی جگہ سے سات سات گز نکل جاتے تھے اور اپنے زانوں پر اس زور سے ہاتھ مارتے تھے کہ لٹھے کا نیا پاجامہ پھٹ جاتا تھا۔ پاس کے لوگوں کو موقع پاکے دہولیں بھی جما دیتے تھے۔ اور فخر کیساتھ یہ فرماتے تھے کہ استاد غالب کی تقلید کر رہا ہوں اُنکے نامی شاگرد منشی احمد علی عشرت گیاوی میرے دوست صادق الوداد تھے برادرانہ مراسم رکھتے تھے وہ البتہ کہتے بھی اچھا تھے اور پڑھتے بھی خوب تھے آواز اُنکی بہت بلند تھی منہائی رات میں مشاعرہ کے روز محلہ کا کوئی آدمی سو نہ سکتا تھا اُچھل کود نہ تھی ہاں شعر پڑھتے وقت جوش میں کھڑے ہوجاتے تھے۔ یہ سرِ مشاعرہ بھی شراب پیتے تھے اور کہتے تھے کہ مرزا غالب کا نام زندہ کر رہا ہوں چھریرا بدن۔ میانہ قد گورے آدمی۔ پچاس پچپن برس کی عمر میں مرے ہونگے۔ اُنکی صورت کیطرح وہ دو مشاعرہ بھی آنکھوں میں پھرتے ہیں جنمیں میں خود شریک تھا ایک طرح تھی سحر ہوتے نہیں اثر ہوتے نہیں۔ چنانچہ اس شعر کو مصرع اول میں نسیم کو مخاطب کرتے ہوئے منہ موڑ کے اظہارِ نفرت فرماتے ہوئے کہا کہ ؎

بقیہ مضمون صفحہ ۶۲ میں ملاحظہ ہو

تصانیف مومن

۱۔ کلیاتِ اردو ۔ مع قصاید و مثنوی ۔ و جمیع اقسامِ نظم مرتبہ آہی مرحوم یہ سب انتخاب مختلف مطبع میں نہایت غلط چھپا ہے اور مشکوک بھی ہے یہی وہ کلیات ہے جو مرض الموت میں جمع کیا گیا تھا اسکے پہلے مجموعہ دیوان نوشتہ میر حسین تسکین شاگردِ مومن جسکے حاشیہ پر خود خانِ والاصفات کی جابجا تحریریں ہیں مرتب پایا تھا مگر چونکہ تسکین مومن سے چند ماہ قبل مر گئے اسلئے یہ دیوان کے اُنہیں کی تحویل میں تھا دورانِ علالت مومن میں نہ مل سکا مجبوراً دوستوں اور شاگردوں کی کوشش سے کچھ غزلیں فراہم کی گئیں اور وہی بصورت کلیات مُرتب ہوئیں۔ دیوان مذکور کے نسبت حضرت ناصر نواسہ مومن فرماتے ہیں کہ (وہ دیوان آپا میمونہ بیگم مرحومہ نے جو پوتی تسکین کی تھیں پیر عبدالصمد صاحب ساکن کوچہ پنڈت دہلی کو دے دیا تھا میں نے خود اُسکو دیکھا اور بہت کوشش کی کہ وہ نسخہ یا کم سے کم اسکی نقل مل جائے مگر وہ کسیطرح راضی نہوے)

بقیہ مضمون صفحہ ۱۸؎ پہونچی نہ میری خاک بھی جب کوچے یار تک "ہُو چا" تجھسے اے نسیم سحر لوٹتے نہیں۔ شعر پڑھا تھا کہ اس ادا پر واہ واہ کی صدا سے مشاعرہ گونج اٹھا۔ مگر حسرت غالب تھا اسلئے سلام کرتے تھے سرِ تسلیم سامنے کے اوگالدان پر پڑا ہوا ہے مختصر یہ کہ اگر یہ شخص شراب نہ پیتا تو آدمی تھا۔ دوسرے مشاعرہ کا حال سنو کہ ساری غزل پڑھ چکے تو نظر بچا کے مشاعرہ سے باہر نکل گئے اب پھر کمرے کے دروازہ سے داخل ہوتے ہوئے جھک جھک کے تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ؎

باہر ہی سے تسلیم بجا لاتا ہے عشرت | جس بزم میں شغلِ مے و مینا نہیں ہوتا

جب سے انکا انتقال ہوا میں نے مشاعرہ کی شرکت چھوڑ دی حکیم غلام نبی ساسی ہی ایک انکے کہنہ مشق تھے نہ کچھ اُستاد بھائی تھے مگر وہ سید ہی دسے آدمی ہو رہے مترنم کرم فرما تھے وہ بھی مر گئے بطور یادگار انکے دو شعر بھی لکھے جاتے ہیں ؎

ہوتی ہے عمر بھر کی صفائی رُکے نہ ہاتھ | دم بھر تو اور حلق سے خنجر جدا نہ ہو
نازک دماغ یار ہے بگڑے گی بنکے بات | یارب شکستِ دل میں بھی اب صدا نہو

افسوس ان لوگوں کا دیوان تیار ہے مگر کوئی چھپنے کی صورت نہیں۔ گیا ہیں ہمیں لوگوں کی صحبت سے دلی کا نام روشن تھا اب اک خدا کی ذات ہے اور میں ہوں ۔

ناصر صاحب فرماتے ہیں کہ اُسکے حاشیہ کی تطری جانچ کی تو مجکو قطعی الیقین ہو گیا کہ یہ مومن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہی کیونکہ میں نے اُنکی تحریر دیکھی ہی جسکا ذکر آگے آئیگا۔ خاکسار عرش نے پیر عبدالصمد صاحب کو بہت کچھ لکھا کہ آپ مومن کی روح کو نیز اُنکے خیر طلبوں کو تکلیف نہ دیں مگر انہوں نے ۲۸ ماہ صیام ۱۳۴۲ھ کو صاف جواب دیا کہ کیسا دیوان میرے پاس کوئی تصنیف ہی مومن کی نہیں ہی۔ چنانچہ میں نے اسی ملال کے سبب اُنسے دلی میں ملنا پسند نہ کیا۔ اب اصلی حال سُنئے کہ مومن کی حقیقی بہن کی لڑکی آسی سے منسوب تھیں اور میمونہ بیگم اُنہیں کی صاحبزادی کا نام ہی جنکی شادی سیف الدین مرحوم سے ہوئی تھی جو ماموں زاد بھائی پیر عبدالصمد صاحب کے تھے اور پیر عبدالصمد صاحب کالے صاحب کے گھرانے کے ہیں جنکی تاریخ مرگ مومن نے لکھی ہے۔ غرض جب یہ تعلقات مومن خاں صاحب کے گھرانے سے وابستہ ہوئے اور سید احمد صاحب امام مسجد جامع کی کچھ اندرونی تحریک ہوئی تو سالہا سال کے بعد یہ دیوان منتقل ہوتا ہوا پیر عبدالصمد صاحب تک پہونچ گیا۔ اب تو دانائی و خداداد ذہن کے سوا کیا فیصلہ کیا جا سکتا ہے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن — خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

میں کیسے کم تری کاوشوں کے بعد پتہ بتاتے جاتا ہوں۔ کوئی خدا کا بندہ ایسا پیدا ہو جائیگا جو گڑے ہوئے خزانہ کو اکھاڑ ہی لیگا۔ تذکرہ نویسوں نے اسی رشتہ کو سُن کے آسی کو مومن کا داماد لکھا ہی درحقیقت وہ اُنکی اُس بہن کے داماد تھے جن کو مومن بہت مانتے تھے معلوم ہوتا ہی کہ اسی سبب سے یہ دوران علالت مومن میں بھی موجود تھے اب بات اتنی ہو کہ جب تک کہ دیوان سامنے نہ آئے فیصلہ نہیں ہو سکتا ہی کہ اسمیں وہی غزلیں ہیں جو موجودہ کلیات میں ہیں یا کیا۔

دیوانِ فارسی

اسکو حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے ۱۸۵۷ء سے پہلے ترتیب دیکر مطبع سلطانی

دہلی میں چھپوایا تھا۔ اب کمیاب ہی۔ فقیر عرش نے کچھ کلام اُس سے حاصل کیا ہی جو آگے درج کیا جائیگا۔ صاحبِ تذکرہ گُلِ رعنا کا میں بھی ہمخیال ہوں یعنی کلامِ فارسی بھی اپنے رنگ میں لاجواب ہے اور وجہ دلفریبیاں کہ مومن کے کلامِ اُردُو کے ساتھ مخصوص ہیں اسمیں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مومن کے انتقال کے تین سال بعد یہ کتاب چھپی۔ اس میں (۹ قصاید۔ ۱۵۰ غزلیات۔ ۱۷۱ رباعیات۔ ۸۵۔ قطعات ہیں)

۳۔ انشائے فارسی

یہ کتاب بھی مطبع سلطانی دہلی میں غدر سے پہلے چھپی مگر بجز پُرانے کتب خانوں کے کہیں پائی نہیں جاتی۔ اسکو بھی حکیم احسن اللہ خاں وزیر بہادر شاہ ظفر و عزیز مومن نے چھپوایا ہے۔

۴۔ جانِ عروض۔

جب نسیم دہلوی نے دہلی کو ترک کیا اور لکھنؤ آنے لگے تو اُستاد کی یہ قلمی کتاب بطور تبرک ساتھ لیتے آئے اور اسکو بڑی حفاظت سے اپنے تکیہ میں رکھتے تھے۔ اُستاد تسلیم نے بھی اسکو دیکھا تھا کہتے تھے۔ کہ کتاب عروض و قوافی میں نہایت مفید تھی مگر افسوس کہ نسیم کے سرمایہ کے ساتھ لُٹ گئی۔ بہر حال میں اسلئے اسکا پتہ دیئے جاتا ہوں کہ شاید کبھی برآمد ہو جاتے۔ کیونکہ ابھی آزاد نے آبحیات میں دیوانِ میر حسن کے ناپید ہو جانے کو لکھا تھا۔ مگر تقریباً ڈیڑھ صدی کے بعد نظر افروز زمانہ ہے۔ اور علیگڈھ میں چھپا ہی۔ اور تعجب یہ کہ میر انیس اور میر نفیس تک کو اسکی خبر نہیں۔

۵۔ شرح سدیدی و نفیسی۔

جب خانصاحب حکیم مظہر علی مرحوم کے یہاں سہسوان میں مہمان تھے تو یہ انکی تحریک پر ان مشکل کتابوں کی شرح لکہی تھی حکیم منظر علیصاحب وکیل جنکا ذکر کرچکا ہوں اُنکے پاس یہ کتابیں موجود ہیں اور مومن کے قلم کی لکہی ہوئی ہیں حضرتِ ناصر نے

ان کتابوں کو بھی دیکھا ہے مگر اسکا جواب کیا کہ ہم نہ دینگے ہائے ؎

صبر یا رب مری وحشت کا پڑیگا کہ نہیں　　چارہ فرما بھی کبھی قیدیِ زنداں ہونگے

میں جو آزاد کی عدم توجہی کو جا بجا رو رہا ہوں تو لوگ فرماتے ہونگے کہ اُنکی کیا خطا وہ کیا کرتے۔ میں کہتا ہوں کہ مومن کے قافلہ کے کوچ کرنے کے بعد بلکہ مجھسے پچاس سال آگے وہی ایک شخص اس مذاق کے دہلی میں تھے اگر وہ چاہتے تو کھڑے کھڑے یہ سارا خزانہ زمین سے اگلوا لیتے۔ مگر اسکا جواب کیا کہ وہ تو مومن کو مٹانا چاہتے تھے۔ اب میں منزلوں دور کا رہنے والا۔ اس عہد میں کہ مذاق ان باتوں کا نہ رہا۔ شاعری خود اپنی صورت بدل رہی ہے کیا کروں۔ اور تنہا کس کس سے لڑوں۔

خواصِ پان۔

یہ رسالہ پان کے خواص میں لکھا تھا۔ اسکے افعال اور خاصیت میں بڑی رنگیں بیانی صرف کی ہے آج بھی مومن کے ایک عزیز کے قبضے میں ہے اور وہ بزید قدر دانی اسکو پاندان میں بند رکھتے ہیں اگر مانگو تو منہ لال کر دیں۔ اب کس کس کی شکایت کیجئے ؎

دو لو ابرو دو گیسو چار موذی ہیں ہم　　ایک تو بچھو کا جوڑا ایک جوڑا سانپ کا

خاکسار عرش نے دلّی جا کے اس پاندان کو بھی چھانا مگر آفریں اس پردہ داری پر کہ مومن کی اس کتاب کا سُراغ نہ چلا۔ گویا ؎ ناسخ

مسی آلودہ لب پر رنگِ پان ہے　　تماشہ ہے بہم آتش دھواں ہے

کلام غیر مطبوعہ مومن

حکیم منور علی آشفتہ شاگرد رشید مومن۔ جو انور تجارہ کے رہنے والے اور نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے مصاحب تھے اونکے پوتے جناب حامد حسین صاحب بونڈری آوفیسر ریاست دیتا ضلع بندیلکھنڈ۔ میں ہیں۔ یہ از راہ اہلیت صراغ رسانی فرماتے ہیں کہ میرے جد بزرگوار کے نام مومن کے لکھے ہوئے چند خطوط

اور قریب سو ڈیڑہ سو غزلیں کتب خانہ الور میں موجود ہیں۔ عنقریب وہاں سے لا کے قبل طبع اس تاریخ کے دونگا خدا توفیق عطا فرمائے مگر کچھ نہیں تو ڈیڑہ سو خطوط لکھہ چکا وہ روز وعدہ وفا کر رہے ہیں پاتے ؎

باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے　　　　وان یہ پہونچا کہ فرشتہ کا بھی مقدور نہ تھا

درستی مزار مومن کا اور اس کتاب کے بہم پہونچانے کا وعدہ تو ناصر صاحب نے بھی فرمایا ہوا اسلئے اسکے جواب دہ وہ ہونگے۔ اگر اس کتاب کے چھپنے تک میں کامیاب ہوگیا تو خیر ورنہ کوئی اور بندۂ خدا اسکو کریگا۔ کیسے کم ناظرین میری کاوشوں اور جگر خراشیوں کو یاد کر کے مجھے ایک سورۂ فاتحہ سے تو نہ محروم رکھینگے۔

انداز تحریر مومن۔

اب دنیا کے پردے میں اسکے دیکھنے والے صرف مولانا ناصر ہیں اور وہ فرماتے ہیں کہ انکی تحریر خط شیفتہ سے ملتی ہوتی ہے۔ افسوس کہ لوگوں نے اسکے عکس تک کے دینے سے انکار کر دیا۔ ورنہ اس کتاب میں ضرور درج کرتا ہاتے ؎

دیتا دل مضطر کو تری کچھ تو نشانی　　　　پر خط بھی ترے ہاتھ کا لکھنا نہیں آتا

طریقۂ اصلاح۔

ایک روز حکیم مومن خان کا دربار لگا ہوا تھا کہ انکے شاگرد میاں خیر الدین یاس جو عاشق مزاج بھی تھے عالم اضطراب میں آئے اور کہا کہ استاد ایک مطلع ہوا ہے اسپر اصلاح ہو جائے۔ مومن اداشناس تھے مسکرا کے فرماتے ہیں کہو۔ یاس عرض کرتے ہیں ؎

ہجر میں کیونکر پھروں ہر سو نہ گھبرایا ہوا　　　　وصل کی شب کا سماں آنکھوں میں ہے چھایا ہوا

مومن شعر کا روئے سخن پھیرتے ہوئے منہ پھیر کے فرماتے ہیں کہ یوں کہو ؎

اس طرف کو دیکھتا بھی ہے تو شرمایا ہوا　　　　وصل کی شب کا سماں آنکھوں میں ہے چھایا ہوا

نگاہ والے سمجھ سکتے ہیں کہ شعر کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ دلی کے ایک کہنہ سال شخص راوی ہیں کہ

تسکین نے جب یہ مصرع کہا کہ ع کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی + تو شب بھر انکو مصرع اول کی تلاش رہی۔ آخر صبح کو خانصاحب کے پاس آئے۔ خانصاحب کے یہاں ایسے شعروں کے ڈہالنے کو سانچے پڑے رہتے تھے فوراً ارشاد ہوتا ہو کہ ؎

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے   کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

جب یہ شعر مشاعرہ میں پڑہا گیا تو بعض لوگوں نے کہدیا کہ یہ مومن خاں ہیں۔ چنانچہ آجتک گو کلیاتِ مومن میں نہیں مگر یہ شعر مومن کے نام سے مشہور ہے۔

شاگردانِ مومن اور اُنکا کلام

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ و حسرتی رئیسِ پلول و جہانگیر آباد

یہ اُردو اور فارسی میں حکیم مومن خانصاحب کے شاگرد تھے۔ بعد انتقالِ مومن کچھ فارسی کلام غالب مرحوم کو بھی دکھایا تھا۔ مگر اُردو میں خاتمہ مومن کے نام پر ہوا۔
یہ مومن کے بہترین شاگرد اور صحبت لوگوں میں تھے۔ جہاں مومن و غالب و صہبائی و آشفتہ وغیرہ جمع ہوتے تھے وہاں اُنکی بھی اک امتیازی جگہ تھی۔ عربی فارسی کے فاضل تھے طبیعت نکتہ سنج واقع ہوئی تھی۔ آگے شراب بھی پیتے تھے مگر ادہر توبہ کرلی تھی اور حج کعبہ بھی مشرف ہوتے تھے۔ غدر میں انکی ریاست آفاتِ آسمانی سے محفوظ رہی۔ انکا اُردو دیوان اور تذکرہ گلشنِ بیخار تو چھپ گیا ہے بقیہ اور سرمایہ جیسے مومن کا بھی مال تھا لٹ گیا۔ مذاق انکا نہایت سلیم تھا۔ شمس العلما حالی مرحوم کہ عرصہ تک انکی مصاحبت میں تھے بیان کرتے تھے کہ ایکروز انکی صحبت میں میر انیس کے مرثیہ کا ذکر آگیا وہ فرمانے لگے یوں تو وہ چار جلدوں کے مالک ہیں اور انکے کلام کی داد نہیں دی جاسکتی مگر یہ نہ بھی ہوتیں تو صرف انکا یہ مصرع حق مرثیہ گوئی کے ادا کرنے کو کافی ہے۔ اسمیں اسوقت کی تصویر کھینچی گئی ہے جب امام حسین علیہ السلام بے مونس و غمخوار میدانِ کربلا میں نکلے تھے ع

آج شبیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے   الله الله عجب یاس اور سناٹا ہے

بعض حضرات کا یہ خیال ہو کہ یہ فارسی میں صرف غالب کے شاگرد تھے مومن کے نہ تھے یہ ثبوت اسکے ایک غزل کے کچھ شعر تمہیں دکھاتا ہوں جسکے مقطعوں سے غالب و شیفتہ کا معاصرانہ انداز ظاہر ہوتا ہے اور یہ مومن کی حیات کی غزل ہے شیفتہ ؎

درز دصلائے جلوہ و خلقے برشک سوخت — دستِ کرم کشادہ و ممنون نہ کردہ کس

زیں غم کہ ساغرِ مئے گلرنگ نشکند — یادے حکایت دلِ پرخوں نہ کردہ کس

اے حسرتی مپرس نہ غالب کہ از غزل — آن کارِ میکند کہ بافسوں نہ کردہ کس

نواب صاحب فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ مرزا غالب انکے مقطع کا جواب دیتے ہیں ؎

غالب ز حسرتی چہ سرائی کہ در غزل — چوں اُو تلاشِ معنی و مضموں نہ کردہ کس

انکی اردو شاعری کا مذاق کسقدر سلیم تھا اسکے ثبوت میں صرف ذیل ہی کا شعر کافی تھا مگر ناظرین کی خاطر سے چند شعر اور بھی لکھے دیتا ہوں۔

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی — میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

ولہٗ

اے مرگ آکہ میری بھی رہ جائے آبرو — رکھا ہے اُس نے سوگ عدو کی وفات کا

دشمن کہیں گیا نہ ہو آنکھوں سے شیفتہ — اُسکی گلی میں آج نشانِ قدم نہیں

ذیل کے شعر کا جو انداز ہے وہ صرف مومن کی ذات سے وابستہ ہو اور بس ؎

تنگ اتنا نہ کر اے شوقِ ہم آغوشی کہ وہ — ڈھونڈھتے ہیں چلے جانے کو بہانہ شبِ وصل

دیوان انکا دوبارہ علیگڈھ میں چھپ گیا ہے اہل ذوق اُسکو ملاحظہ فرمائیں۔

رئیس ابن رئیس نواب محمد اکبر خان۔ اکبر تخلص تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر۔ یہ شیفتہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ کثر جہانگیر آباد اور زیادہ دھلی اور راولپنڈی میں رہا کرتے تھے۔ راولپنڈی میں انتقال بھی ہوا۔ دوران قیام دھلی میں شعر بھی کہا کرتے تھے

اور مومن سے اصلاح لیتے تھے۔ دیوان کا پتہ نہیں چلتا۔ ہاں تذکروں سے چند شعروں کا ہار تیار کرکے انکے مزار پُر انوار پر چڑھا دیتا ہوں اور ایک سورۃ فاتحہ پڑھ دینا سعادت جانتا ہوں۔ میرے خیال میں انکی شاعری کا پایہ شیفتہ سے زیادہ بلند ہوتا اگر ان کی حیات وفا کرتی۔ سرسید مرحوم بھی انکی سخن آرائیوں کے معترف ہیں کلام میں نازک خیالی اور مومن کا انداز بہت ہے

خانۂ غیر میں گر لگنے لگا جی تیرا — ہمکو بھی اور سے آتا ہی لگانا دلکا
قتل کر لاشۂ اکبر کو چھپایا گھر میں — ہائے اُسنے مجھے جانے نہ دیا کوچہ میں
کون رویا ہے ترے کوچے میں رات — کیوں سفیدی اُڑ گئی دیوار کی
اللہ رے سوزِ سینہ کہ دامانِ چرخ میں — شعلہ لپیٹ گیا نفسِ آتشیں کیسا تھا
ہم مر گئے اور اس نے نہ جانا کہ مر گئے — ہر زخم پر جو ہلتے تھے لب آفریں کیسا
واں رسمِ اختلاط سے انکارِ وعدہ تھا — یاں جان ہی نکل گئی اپنی نہیں کیسا تھا

طوفانِ نوح و گریۂ اکبر میں فرق ہے
یعنی کہ آسمان کو ڈبویا زمیں کے ساتھ

فارسی میں بھی شعر کہتے تھے مگر کلام دستیاب نہوا۔

نواب محمد اصغر علیخاں نسیم دہلوی۔ ابن نواب آقا علیخاں قاچار۔
یہ دلی کے خاندانی رئیس تھے۔ جب تباہی آئی تو ترکِ وطن کرکے لکھنو چلے آئے یہ مومن کے ان تلامذہ میں سے تھے جنہوں نے مشاعروں کے ذریعہ سے دھلی اور لکھنو میں مومن کے نام کو روشن کیا۔ ناسخ و آتش کے عہد میں آبرو پائی۔ اُنکے نامی تلامذہ بحر۔ رشک برق۔ وزیر۔ خلیل۔ وغیرہ کے ہمصحبت اور ہمعصر ہے دیوان ضخیم چھوڑا جسکو تلامذہ نے ترتیب دیکر چھپوایا۔ انکا یہ کارنامہ تعجب کے لائق ہے کہ جسوقت لکھنو۔ دھلی کے فیضان کا محتاج نہ تھا اپنی شاعری کا ڈنکا بجایا اور دلی والوں کے ظرف

سے لکھنو والوں کو تنہا مخاطب کر کے کہا کہ ؎

نسیمِ دہلوی ہم موجدِ باب فصاحت ہیں | کوئی اردو کو کیا سمجھیگا جیسا ہم سمجھتے ہیں

تلامذہ میں انکے منشی امیر اللہ تسلیم۔ منشی اشرف علی اشرف۔ افسر۔ مہر۔ عاشق وغیرہ نام آور ہوئے۔ وارستگی سے ناچار تھے۔ اپنے شاگرد اور کفیل نواب[۱۲] محمد تقی خان افسر کے اصرار سے بوستان خیال نظم کرنے بیٹھے مگر اسکی بھی تکمیل نہو سکی ناچار نواب نے منشی طوطہ رام کا منہ چنوں کے عوض موتیوں سے بھر کے کتاب ختم کرائی چنانچہ طوطہ رام صاحب خود لکھتے ہیں کہ ؎

لکھا یا ننک نسیمِ دہلوی نے | لکھا ہے یاں سے طوطہ رام جی نے

انکو آخر عمر میں کیمیا کا شوق ہو گیا تھا شبانہ روز گھر کے اندر اسی دھن میں رہتے تھے۔

ف ۱۲ انکا کچھ حال اردو بیگم صاحبہ نے بھی لکھا ہے۔ انکی فیاضیوں کا قصہ لکھنو کے کوچہ و بازار میں مشہور ہے اُستاد تسلیم فرماتے تھے کہ انکے مکان کے سامنے ایک گوشہ گیر خانہ نشیں تباہ حال مرزا صاحب رہتے تھے جب انپر فاقے ہونے لگے تو انکی بی بی نے اس پر مجبور کیا کہ نواب کے پاس جاؤ چنانچہ یہ ایکروز آئے مگر غیرتِ شرافت سے کچھ کہہ نہ سکے اس رئیس مردم شناس نے انکو دیکھ کے ایک عمل دستِ غیب کا ذکر چھیڑ دیا اور کہا کہ مرزا صاحب ہر شب جمعہ میں آپ دروازہ کو اندھیرا کر کے ایک ہاتھ باہر نکال لیں اور آنکھوں کو بند کر کے قرآن کی فلاں آیت مع درود شریف ایکسو ایک بار پڑھ لیا کریں مردانِ غیب جو آپکے مقدور کا ہوگا بے طلب دے جایا کرینگے۔ جنانچہ جب آدھی رات ہوتی تھی اور گلی میں سناٹا ہو جایا کرتا تھا تو نواب خود انکے ہاتھ میں اک مناسب رقم جا کے دے آیا کرتے تھے یہانتک کے مرزا صاحب کی عمر کا بڑا حصہ آبرو کے ساتھ گزر گیا نواب کی موت کے بعد وہ نہایت خستہ حال ایکروز بازار میں اُستاد سے ملے پیٹ کر رونے لگے اور کہا کہ افسوس نواب کے بعد وہ بات جاتی رہی اُستاد تاڑ گئے کہ مرداں غیب یہ سب انہی مرحوم کی پوشیدہ فیاضی تھی۔ ہائے اب ایسے پاک طینت نفوس کبھی نظر نہ آئینگے ؎ میر ضیا دہلوی

ضیا کیا درد مضمن ہو ترے دل میں میاں کچھ | کہ جب تو بات کرتا ہے تو ٹھنڈے سانس بھرتا ہے

یہانتک کہ چند روز بیمار رہکر راہی ملک جنان ہوے۔ مصحفی کے نامی شاگرد منشی مظفر علی اسیر نے تاریخ لکھی ع

شد بحوران ارم از چمن دہر نسیم

نسیم کی موت کے بعد نواب ملکوتی صفات نے خرچ راہ دیکر انکی بی بی کو حج کیلئے بھیدیا۔ جہاں سے وہ پھر نہ پلٹیں۔ اک اور منکوحہ تہیں وہ بہی مرگئی۔ ایک لڑکا تہا وہ ماں کیساتھ جو حج کو گیا تو واپس نہیں ہوا۔ نسیم کا دیوان مطبوعہ ہر جگہ ملتا ہی مگر پہر بہی چند شعر نذر ناظرین کئے دیتا ہوں۔ زبان انکی متروکات سے پاک ہی۔ کلام میں دہلی کی جھلک کم اور لکھنؤ کا رنگ زیادہ ہی۔ بہر حال پہر بہی یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہی کہ کلام اور فن کے لحاظ سے تلانذہ مومن میں انکا درجہ بہت بلند ہے۔ یہ اشعار گہر بار انکے ہیں۔ جنمیں بلند پروازی و نازک خیالی بہی ہے۔

خالی نہیں فلک بہی جنوں کے عذاب سے
پہنے ہی طوق دایرۂ آفتاب سے

رہتی نہیں کسیکی ہمیشہ برہنگی
پائی زمین نے چادر نور آفتاب سے

یہانتک اوج جنوں میں مجھے کمال ہوا
خراش ناخن دیوانگی ہلال ہوا

ہاتھ میں خنجر کمر میں تیغ تیز
یہ ارادے ایک مشت خاک کے

جوانی و حسن و جاہ و دولت یہ چند انفاس کے ہیں جہگڑے
اجل ہی استادہ دست بستہ نوید رخصت ہر ایک دم ہے

ذیل کے اشعار کی پاکیزگی ملاحظہ ہو۔

حاجت شمع نہ پروانے چراغ لحد کی
پاک احسان سے مزار غربا ہوتا ہے

آنکھیں وعدہ فراموش کہ فرصت کم ہے
دم کوئی دم میں قفس محبوس قضا ہوتا ہے

اے نسیم چمن آرائے فصاحت تجھسے
معنی گلشن نوخیز ہرا ہوتا ہے

سینے میں سے کچھ آئی آواز
پہوٹا کوئی آبلہ جگر کا

جی ہی تو ہی کیا عجب بہل جائے　　کچھ ذکر کرو ادہر اُدہر کا
کسی صورت سے دل کو شاد کرنا　　ہمیں دشمن سمجھ کر یاد کرنا
جنازہ اُٹھ چکے میرا تو تم بھی　　ادا رسم مبارکباد کرنا

میر حسین تسکین۔

یہ دلی کے ایک سپاہی زادے تھے۔ اور مومن کے ان سعادتمند تلامذہ میں سے ہیں جنھوں نے اوّل اوّل مومن کا دیوان صاف کیا تہا۔ اور وہ نسخہ ہنوز موجود ہے جسکا ذکر کر چکا ہوں۔ آگہی انہیں کے صاحبزادے تھے۔

تسکین کی شاعری کے نسبت میرا یہ فیصلہ ہے کہ اگر زندگی انکی وفا کرتی تو یہ میر مہندی مجروح کے برابر ہوتے۔ آج بہی اپنی شیرینی زبان کے سبب انکی شہرت ان سی کم نہیں۔ چند ابتدائی غزلیں علامہ صہبائی کو بہی دکھلائی تہیں مگر جب مومن کے یہاں آئے تو انہیں کے نام پر خاتمہ ہوا جوان ہی مرے۔ ایسے ایسے زبردست تلامذہ میں اگر کوئی بہی زندہ رہتا تو مومن دنیا سے ناکام نہ جاتے۔ یہ کلام بلاغت نظام ہی۔

گیا مجنوں نکل صحرا کو یہ دیوانگی دیکھو　　فضائے کوچۂ لیلے کو اُسنے تنگ ٹھہرایا
وحشت اب لاش کو لے بہاگے گی　　تنگیِ گور سے گہر یاد آیا
کوچۂ یار میں بیٹھے تسکین　　پاؤں رکہا تہا کہ سر یاد آیا
چین سے بیٹھے تری محفل میں تسکیں رات بہر　　اُس پہ چہانا نہ ہمکو رنگ کی تغیر سے
تسکیں نے لیکے نام ترا وقت مرگ آہ　　کیا جانیں کیا کہا تہا کسی نے سنا نہیں
قاصد آیا ہی وہاں سے تو ذرا تہم تو سہی　　بات تو کرنے دے اُس سے دل بیتاب مجھے
فتنۂ محشر کا تہا سب کو گماں　　تجکو پہچانا تری رفتار نے
کیوں ٹہریوں بر جنگِ سگانِ سر کو ہے　　وارث ہیں یہ کیا عاشقِ مسکیں کے تمہارے
دیکھو خانہ خرابی غیر واں قابض ہوا　　جسکے گہر کو ہم سمجھتے تھے کہ اپنا ہو گیا

میر مجروح کا جو ذکر ہی کیا ہے تو انکا بھی دو اک شعر سنتے جاؤ اور اگر انکی تصویر دیکھنی چاہو تو رسالہ ادیب کے صفحات میں دیکھو ۔

وہاں کی بھی ہے سیر کرنی ضرور — سفینے کو جانے دو گرداب میں
اغیار کے آنے کے دکھا دینگے نشاں اور — بس آپ نہ کھلوائیے اب میری زباں اور

آہی ۔ میر عبد الرحمن خلف میر حسین تسکین مرحوم ۔

انکا ذکر آگے آچکا ہے۔ افسوس دیوان انکا چھپا نہیں کچھ اشعار جو مشکل سے دستیاب ہوئے ہیں درج کئے دیتا ہوں۔ کلام انکا باپ کے انداز اور مومن کے رنگ سے مشابہ ہے ۔ سنو ۔

ہے غلط وہم کہ نکلا تھا وہ گھر سے باہر — شہر میں چاک کسیکا تو گریباں ہوتا
اٹھ کہیں ہے آمد آمد اس ستمگر کی یہاں — اہل محشر مجکو یہ مژدہ سنا کر رہ گئے

افسوس انہوں نے بھی عمر طبعی نہ پائی ۔

آشفتہ حکیم منور علی خلف سید علی رضوی مرحوم ساکن الور ۔

انکا ذکر بھی آگے آچکا ہے اب انکی اولاد کے آگے دست سوال پھیلائے کھڑا ہوں خدا انکے در سے ناکامیاب ہی کیوں نہ پھر جاؤں ۔ میر

قلم چل بھی تیری چلتی زباں ہے — کچھ بات کرنے کی فرصت کہاں ہے

آشفتہ کا کلام بھی سن لو ۔

سنا تھا ہمنے آشفتہ کو کوئی دم کا مہماں ہے — کئی دن ہوگئے اسکو نہ جیتا ہے نہ مرتا ہے
بہت روتے تو اپنی جان کھوتی — کسیکا ہمنے تلافی لیا کیا

قلق حکیم مولا بخش میرٹھی ۔

تلامذہ مومن میں یہ بچارے بھی غنیمت ہیں بہت صاف لکھتے ہیں ۔

دیکھو ستم ظریفی وہ وہ دل فگار کی — اک آسمان کو پہونچا اک آسماں بنایا

فصلِ بہار اپنی گذری تو یوں ہی ساری — یاں آشیاں بنایا واں آشیاں بنایا

بیتاب۔ صاحبزادہ نواب عباس علیخاں رامپوری۔

ارکانِ ریاست میں سے تھے۔ اور اسی زمانہ میں مومن کے شاگرد بھی ہوئے تھے جب وہ رامپور تشریف لیگئے تھے۔ اندازِ بیاں سے پتہ چلتا ہی کہ بلند طبع و باخبر شعرا میں تھے۔ دیوان معدوم مگر مشکل سے ایک شعر اور ایک قطعہ ہاتھ آیا ہے۔ جو پیش کرتا ہوں ؎

دید سے روزِ جزا کے بھی رہونگا محروم — یہ نظر آتی ہو طولِ شبِ ہجراں مجکو

قطعہ

معمور ہے خدا کی عنایت سے میکدہ — ساقی اگر نہیں ہو نہ ہو مے سے کام ہو

بیتاب پی خدا نے دیے ہیں تجھے بھی ہاتھ — یہ خم ہو یہ سبو ہے۔ یہ شیشہ یہ جام ہو

بیمار۔ شیخ علی بخش سنبھل مرادآبادی۔

نظام شاہ رامپوری کی تذکرہ شعرا سے صرف اتنا پتہ چلا کہ یہ مومن خاں کے شاگرد تھے اور اشعار سے اتنا کھلا کہ نہایت نازک خیال تھے۔ ذیل میں دو شعر لکھے جاتے ہیں۔

لب جو کون سیر کو آیا — موج منہ چومتی ہے ساحل کا

سانس آہستہ لیجیو بیمار — ٹوٹ جائے نہ آبلہ دل کا

بارک اللہ واہ کیا کہنا۔

ہو۔ شہزادہ مرزا غلام فخر الدین برادر شہزادہ مرزا صابر دہلوی مرحوم۔

یہ مومن کے بہترین تلامذہ میں تھے۔ کلام انکا غدر میں تلف ہو گیا صرف ایک شعر جو سنا وہ درج کرتا ہوں۔ ع مٹے ناامیدوں کے نشاں کیسے کیسے ؎

اب ہے کیا باقی جو کاوش ہو تری دستِ جنوں — چاک دامن ہو گیا ٹکڑے گریباں ہو گیا

لگے ہاتھوں شہزادہ مرزا صابر کا بھی ایک شعر سن لو۔ یہ اخیر عمر میں دہلی کو ترک کر کے بنارس چلے آئے اور یہیں (خاکی چادر اوڑھے ہوئے) سوتے ہیں مرزا داغ کو جب کبھی

محاورہ میں شک پیدا ہوتا تھا تو انہیں سے پوچھتے تھے۔ سہ صابر

جھلک ہے یگانوں میں بیگانگی کی — سفید اس زمانہ کا ایسا ہوا ہے

برق۔ قاضی نجم الدین ابن قاضی سراج الدین سکندر آبادی۔

آپ بھی مومن کے ہمنشیں اور تلامذہ میں سے ہیں۔ اونچا قد۔ سانولا رنگ۔ نہایت وضعدار۔ خوش مزاج آدمی تھے۔ سر پہ لمبے لمبے بال رکھتے تھے۔ مومن کی عدیم الفرصتی میں تسکیں کو بھی اپنا کلام دکھا لیتے تھے۔ یہ اشعار انکے ہیں ؎

وحشی نے تیرے خاک اُڑائی یہاں تلک — ملتا نہیں زمیں کا پتہ آسماں تلک
بزم اغیار ہو ٹھیک ہے نہ خفا تو ہو جائے — ورنہ اک آہ میں کھینچوں تو ابھی ڈھ ہو جائے

راحت۔ مرزا محمود بیگ دہلوی

یہ فراش خانہ میں رہتے تھے۔ حکیم مومن خاں کے شاگرد تھے۔ چونکہ خاکسار کی شادی اسی محلہ میں صوبہ دار مرزا عبد اللہ بیگ کی پوتی سے ہوئی تھی اسلئے یہاں کے لوگوں سے نام انکا سنا مگر افسوس کہ مفصل حال معلوم نہوا۔ صرف ایک شعر ان کا مشہور ہے ؎

ہنسے تو وہ بھی چھٹے اور دل شیدا چھوٹا — یاد کس کس کو کریں خیر چھٹا چھوڑا

سالک۔ مرزا قربان علی بیگ مرحوم

یہ مومن کے قدیم اور اچھے تلامذہ میں تھے چونکہ مومن کی حیات تک مشق انکی ناتمام تھی غالب سے اصلاح لینے لگے۔ صاحب دیوان ہیں۔ مومن کا انداز انکے شعروں میں دیکھ لو۔

دل وہ کافر ہے کہ مجھ کو نہ دیا چین کبھی — ہو وفا تو بھی اسے لیکے پشیماں ہوگا
جب تھک کے تری راہ میں بیٹھے تو کہا چل — جو کہ رستے میں ہوتے ہیں وہی کچھ پاتے ہیں
یوں عمر گذاری تری فرقت میں کہ ہر دم — جینے کا گماں تھا نہ مجھے مرنے کا یقیں تھا

راسخ۔ سعادت علیخاں متوطن دہلی۔
یہ نام و نشان اٹھے۔ مومن کے تلامذہ میں تھے ایک شعر انکا تذکرہ والوں نے
لکھا ہے ؎

ہوں تو آنکھو نہیں پر نہیں یہ خبر   سُرمہ ہوں یا غبار ہوں کیا ہوں

صاحب۔ یہ بھی امۃ الفاطمہ بیگم عرف صاحب جی۔ زن پردہ نشین
تھی وہ ہیں جنھوں نے مومن کے عشق کا بیڑا اٹھایا تھا۔ انکا حال آگے لکھ چکا ہوں۔
یہاں صرف انکے چند اشعار پر تذکرہ ختم کرتا ہوں۔
مومن خاں صاحب کے سامنے جلنے جلانے کا مسئلہ پیش کرتی ہیں اور اس طرح ان کے
عشق کی آگ کو بھڑکانے کو کہتی ہیں کہ ؎

رقیبوں کا جلنا کہاں دیکھتا تو   سماں یہ مرے گھر میں آیا تو دیکھا

اب پھر انکے نہ ہونے پر توجہ فرماتے ہوئے کہتی ہیں کہ ؎

گنہ کیا صنم کے تقاضے میں زاہد   خدا نے یہ جلوہ دکھایا تو دیکھا

اب اپنی نامرادی پر جھلاتی ہیں کہ ؎

جو خط جبیں کا کے کانپ ہو اُسی کو   دکھلا تو مرا نامۂ اعمال الہٰی

اس شعر میں مومن کو کن انکھیوں سے دیکھ کے بارگاہ واہب العطایا میں ہاتھ اٹھاتی
ہیں کہ ؎

صاحب جو بنایا ہے تو مانند زلیخا   یوسف سا غلام اک مجھے دے ڈال الہٰی

چنانچہ وہ کچھ عجیب ساعت تھی کہ انکی دعا قبول ہو گئی اور مومن سا غیور شخص انکا
بندۂ بے دام ہو گیا۔
عظمت۔ پیر عظمت اللہ ولد پیر قدرت اللہ جذب دہلوی۔
یہ پیرزادے بھی مومن کے شاگرد ہیں۔ اور اپنے فقر و فاقہ پر کہ فقیروں کی میراث ہے

شان ہو تظر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

نام عظمت ہے نہ شوکت نہ شکوہ — کیا ہی اس نام سے گھبراتا ہوں

صفیر میاں جان دہلوی —

(میر) حقارت سے دیکھو نہ یہ ٹوٹی قبریں — کہ ہر میں فلاں بن فلاں بن فلاں ہے

یہ اس مشاعرہ کے دیکھنے والوں میں ہیں جنہیں مومن و غالب وغیرہ کی غزلیں پڑھی گئی تھیں۔ ایک شعر انکا ہمرنگ مومن ہو وہ ملاحظہ ہو ؎

ہوا ہو سہو۔ تو پھر خوب یاد کر لیجئے — کہ رہ نجائے کوئی جور آسماں کے لیئے

قیصر۔ شہزادہ مرزا خدا بخش قیصر نواسہ شاہ عالم بادشاہ دھلی —

مومن کے مشہور تلامذہ میں ہیں آخیر عمر تک مشاعرہ کرتے رہے اور مومن بھی شریک ہوا کئے مجمع الاشعار میں انکا بہت کچھ کلام موجود ہے یہاں ایک شعر پر اکتفا کرتا ہوں ؎

تو لطف کرے یا نہ کرے خوش ہو کہ ناخوش — اس بات پہ مرتا ہوں کہ عاشق ہوں ترا میں

کاظم۔ منشی کاظم علی متوطن ضلع بجنور —

مومن کے قدیم تلامذہ میں تھے کچھ کلام انکا ملا نہیں صرف یہ شعر سنا ہے ؎

اے طفلِ اشک ہم تجھے آنکھوں میں یوں رکھیں

اور تو ہمارے راز کو یوں بر ملا کرے

واقعی یہ اسکو لازم نہیں —

مکرم۔ غلام علی ضامن۔ دھلوی —

انکی عمر کا بڑا حصہ حیدرآباد میں گذرا مرتے وقت عہدِ نواب صدیق حسن میں بھوپال آئے اور یہیں کی خاک میں مل گئے آواز انکی بہت بلند تھی مشاعرے پہ چھا جاتی تھی کلام ملاحظہ ہو ؎

ہاتھ ہوویگا مرا اور ترا داماں ہوگا — چاک جب صبحِ قیامت کا گریباں ہوگا

عاشق مزاج تھے بے سروسامانی میں بسر ہوئی بے سروساماں اٹھے یعنی ؎

بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا | چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط

غلام علیخاں وحشت ابن پیر فرحت اللہ خاں مُرادآبادی

یہ مومن کے ارشد تلامذہ میں غالب و شیفتہ کے ہم صحبت تھے۔ علاوہ عربی فارسی کے انگریزی تعلیم بھی انکی بنارس اور مرزاپور میں ہوئی۔ بلند شہر میں سرکار انگریزی کی ممتاز ملازمت پر سرفراز رہے۔ حالی مرحوم نے لکھا ہے کہ مومن کے بعد ہی جب یہ غالب سے ملنے جاتے تھے تو وہ بہت عزت سے پیش آتے تھے اور لپٹا کے کہتے تھے کہ بھئی وحشت۔ زندگی سے وحشت ہو رہی ہے اب وقت قریب ہے یعنی ؎

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید
مرگیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

غالب اسی امید میں زندگی کے دن پورے کر رہے تھے مگر مشیت کہ انکی آنکھوں کے سامنے وحشت و شیفتہ بھی مرگئے اور آخر یہ ہوا کہ حالی نے انکا مرثیہ لکھا۔

وحشت کا کلامِ بلاغت نظام دیکھو قدم قدم پر شانِ استادی نمایاں ہے ؎

تھی بس مرضیِ قاتل تو جدا زندہ ہوا | روزِ محشر مرے تن۔ تن سے سر میرا
میرے مرنے کی خبر غیر کو یوں دیتے ہیں | مرگیا وحشتِ جانباز تری جاں سے دور
جو نہ جاتا ہو کہیں کوچہ جاناں سے سوا | ایسے دیوانے کو کچھ حاجتِ زنجیر نہیں
جو رشِ وحشت سے یہ حالت کہ سایہ مجھ سے | یوں گریزاں ہے کہ سایہ سے گریزاں میں ہوں
میں تو انساں ہوں یہ بیتابیِ دل ہے وہ بلا | ہجر کی شب خواب اچٹا تا ہے فرشِ خواب سے
گرم غم خانہ ہے اتنا آہِ آتش بار سے | بھاگتی ہے دھوپ میری سایۂ دیوار سے

کیا شعر فرمایا ہے۔ بے سبب سر سید انکے مداح نہیں ؎

اُٹھانے کو کسی نے پھر نہ میری آستیں پکڑی
بہ رنگِ نقشِ پا اُس در پہ جب میں نے زمیں پکڑی

ہائے ہائے کیسے تلامذہ منتخب خانصاحب کے نامراد مرگئے انکا دیوان ہی نہ چھپا یہ سبب اولاد کے بدمذاقی کی برکت ہے۔

باس خیرالدین مرحوم دہلوی۔

انکا کچھ حال آگے لکھ چکا ہوں۔ مومن خاں کے یہ ہمنشین اور شاگردوں میں تھے مختصر یہ کہ گمنام و نامآور تلامذہ کا حال دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ مومن کی بھٹی میں شرابِ عشق کے طالب بہت آئے اور برعکس اسکے غالب کے یہاں رند مشرب اور زمین آسمان کے قلابے ملانے والے گئے۔

مومن کے گرد انکے جب چند ہمرنگ تلامذہ جمع ہوجاتے تھے تو مومن کے بے تکلف احباب یہ شعر شاہ اللہ خاں فراق دہلوی کا پڑھتے تھے جسکو سنکے وہ خوش ہوجاتے تھے ؎

رہتا ہے عاشقوں سے انبوہ ہجوم در پہ ہوجائیگا گھر اُسکا بازار رفتہ رفتہ

---

[1] اس شعر نے داغِ دل تازہ کر دیا۔ مولوی امیرالدین احمد امیر جو عیش یادگار مصحفی کے شاگرد اور ہمارے بڑے بھائی تھے اور جنہوں نے ابھی چند مہینے ہوئے کہ انتقال کیا ہو اونکے کچھ شعر اسی زمین میں یادگار رہیں بغرض بقائے نام پیشکش خدمت ناظرین کرتا ہوں شعر اول [2] یہ اپنے مرض ضیق النفس کیطرف اشارہ کرتے ہیں اور یہ اشعار بھی موت کے چند روز پہلے کے ہیں۔ اب عدالت ججی میں پیشکار اور نہایت با وضع لوگوں میں تھے۔ اس فن کا کمال اپنے ساتھ لیگئے ؎

دم تنگ سے چڑھا یہ رستے ہی میں پڑا ہوں منزل پہ جا ہی پہونچے سب یار رفتہ رفتہ
کچھ روز اول اول آتے تھے قبر پر سب ولو "فاتحہ" ہی ہوئے غمخوار رفتہ رفتہ
تلوے میں چبھ گئے ہیں جو اسے امیر خستہ نکلینگے کاوشوں سے وہ خار رفتہ رفتہ

خیر گذشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہو نہیں

مٹا ہوا سا نشان ہر مزار ہوں میں

لو یاس کا اک شعر سنتے جاؤ

شربتِ وصل نہ پینے دو نہ سم کھانے دو   کیا قیامت ہے نہ جینے دو نہ مرجانے دو

مومن کی موت

ہائے   کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس

عروجِ مہر جو دیکھا تو دوپہر دیکھا

کل نفس ذائقۃ الموت۔ کوئی عالم ہو کہ فاضل حکیم ہو کہ ڈاکٹر۔ فقیر ہو کہ بادشاہ پیغمبر ہو کہ ولی شاعر ہو کہ نثار۔ اسکو ایک روز مرنا ضرور ہے۔ اور جو کوئی چاہِ عدم میں گر اوہ گرا۔ پھر نہ نکلا۔ ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد۔ افسوس اپنی آنکھوں سے روز دنیا سے فانی کا نقشہ دیکھ رہے ہیں اپنے عزیزوں اور دوستوں کو خود گورستان میں جا کے سپرد خاک کر آتے ہیں مگر اپنے مرنے کا یقین نہیں۔ دم کا ٹھکانا معلوم اور سو برس کا سامان مہیا ہے۔ حالانکہ انقلاباتِ ہستی ہر وقت پکار پکار کے کہہ رہے ہیں کہ میاں

نہ دیکھو گے کبھی تم خواب میں بھی جو دنیا کا   پڑا رہ جائیگا مرنے پہ سب اسباب دنیا کا

مگر اسکو دل کی جانتے ہیں۔ آمدم بر سر مطلب

حکیم مومن خاں بالکل بھلے چنگے تھے۔ کس بل انکے دم خم میں کوئی فرق نہ آیا تھا ایک بال بھی سر کا نہ پکا تھا۔ نہ وضعداری میں کمی آئی تھی۔ عمر کے لحاظ سے بھی جبکہ قبل غدر ساٹھ برس کی عمر میں آدمی جوان ہوتا تھا یہ بھی تریپن برس کی عمر رکھتے تھے کہ انتقال کیا۔ دیکھنے میں چالیس بیالیس برس کے معلوم ہوتے تھے۔ صورت یہ ہوئی کہ وہ مکان جسکا نقشہ ابھی ابھی دکھلا چکا ہوں اسکی چھت مرمت ہو رہی تھی اور

کھولی گئی تھی نیچے سے مزدور اوپر کو کڑیاں دے رہے تھے یہ اُس مونڈیرے سے لگے ہوئے کھڑے تھے چھت کی اُونچائی کم تھی یکایک جھکے اور ٹھوکر کھا کے کوٹھے سے نیچے آپڑے۔ گرتے ہی بیہوش ہو گئے۔ گھر میں کہرام اور محلے میں ہنگامہ ہو گیا۔ بی بی بچوں نے سر پیٹنا شروع کیا ناصر نذیر صاحب فراق کے والد کہ مومن کے عزیز اور شاگرد تھے دوڑ پڑے اور خاں صاحب کو اُٹھا کے پیچھے کے کمرے میں لٹایا عزیزوں شاگردوں اور دوستوں کی آمد شروع ہوئی جنہیں آہی رہی تھے۔ اُنکے طرف دیکھ کے جب ہوش میں آئے تو فرمایا کہ میاں جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہوا۔ مگر میرا علم یہ کہتا ہے کہ میں صرف پانچ مہینے بچونگا۔ لو میرے مرنے کی تاریخ لکھ رکھو۔ دست و بازو بشکست۔ ۱۲۶۸ھ آخر وہی ہوا۔ غدر سے پہلے سرجری علاج کرنے والے۔ ڈاکٹر کہاں تھے۔ جراحوں اور طبیبوں سے کئے جو ہو سکا کیا آخر جمعہ کے روز صبح کا وقت تھا کہ دنیا سے کوچ فرمایا۔ اور ہوش و حواس میں ہنستے بولتے۔ چلے گئے اعلیٰ علیین میں انکی روحِ پاک نے مقام پایا۔ حسب ہدایت انکا جنازہ مہندیوں میں کہ مشہور اور پرانا گورستان دہلی کا ہے لایا گیا اور یہیں دفن ہوئے۔ نماز مسجد جامع میں ہوئی۔ شہر کے امیر غریب علما فضلا۔ شعرا۔ شہزادے سب جنازہ کے ساتھ تھے۔ اور سب نے انکی جوانمرگی کا سوگ رکھا۔ غالب تو غالب ذوق کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل پڑے۔ اور ہر بزم میں یہی چرچا تھا کہ دہلی کا چراغ بجھ گیا۔ مزار آپکا زیر احاطہ دیوار مقبرہ مولانا شاہ عبدالعزیز رح باہر کے سمت بجانب شرق واقع ہے۔ کوئی کتبہ نہیں کوئی نشان نہیں یہ عزیزوں اور شاگردوں کی اہلیت ہے اس گورستان کی بہترین تصویر ملاحظہ ہو تخمیسِ عرش بر شعرِ تسلیم۔

ہے کہاں یارانِ رفتہ میں زبان التماس — بیکسی سر پیٹتی تھی اک طرف اک سمت یاس
منہدم لوحیں تھیں۔ تھے خار مغیلاں آس پاس — خشک گل افسردہ سبزہ شمع چپ بالیں اُداس

جی بھر آیا عالم گورِ غریباں دیکھ کر

انکے مرنے کی تاریخیں بہت لکھی گئیں مگر آہی سے ماتم مومن خاں سے سال نکالا ہے۔

گو ایک صدی ہونے آئی مگر ابھی چند بوڑھے دہلی میں ہیں جو انکے نشانِ مزار کے بتانے والے ہیں اور یہ انکی مقبولیت و شہرت کے سبب سے ہو ورنہ بڑے بڑوں کے مزار کا پتہ نہیں بہرحال انکے لب گور سے اہل گوش تک یہ صدا آج بھی پیہم آتی ہر کہ

جنت میں روح جسم ہو نیچے مزار کے ۔۔۔ کشتی ہماری ڈوب گئی پار اُتار کے

انا للہ و انا الیہ راجعون ۔

زمین پہ شو رہے ہیں چھوڑا ہی شہ نشینوں کو ۔۔۔ اجل کہاں سو کہاں لائی ہے مکینوں کو

مومن پر اعتراض ۔

انکی حیات تک تو کسی کے منہ میں زبان نہ تھی۔ مگر آزاد صاحب کو مرنے کا انتظار تھا آپ نے بے بصیرتی کے سبب کچھ اعتراضات اپنی کتاب میں بغیر تحقیق ٹانک دئے۔ اور ویسے اعتراضوں کو چالاکی سے ڈھانک دیا جو ذوق پر بھی ہو سکتے تھے۔ خیر میر

ہم ہیں مجروح ماجرا ہے یہ ۔۔۔ وہ نمک چھڑکے ہو مزا ہے یہ

پہلے میں ان اعتراضات کا جواب دیتا ہوں جو اور حضرات کے طرف سے ہوئے اب انکو ملاحظہ فرمایئے ۔ مومن

مجھ پہ طوفاں اُٹھاتے لوگوں نے ۔۔۔ مفت بیٹھے بٹھائے لوگوں نے

کہا جاتا ہے کہ مصرع آخر کی ردیف بیکار ہے۔ بجا ارشاد ہوا۔ اب سندیں ملاحظہ ہوں۔ خواجہ وزیر ۔

ذکر جب ایجان تری رنگین بیانی کا ہوا ۔۔۔ رہ گئی حسرت سے بلبل کھول کر منقار کو

مرزا دبیر ۔

شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو — جبریل لرزتے تھے سمیٹے ہوئے پر کو

مرزا غالب ؎

درد سے میرے ہے تجھکو بیقراری ہائے ہائے — کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

ردیف میں حشو کا عیب تو ہزار جگہ دکھلا سکتا ہوں - اندرونِ شعر حشو سے خالی نہیں ہے ردیف کا کیا ذکر - آتش مرحوم ؎

پڑے ہو غش میں کیا مردہ سنو آتش اٹھ کو کہو لو — خبر کے واسطے اُس بُت کے بھیجا ہے برہمن کو

دوسرا اعتراض - حالتِ عطف و اضافت میں اعلانِ نون کا قایم رہنا کن کن صورتوں میں اعلانِ نون جائز ہے اسکی بحث طویل ہے پھر بھی جس موقع پہ ناجائز کہا جاتا ہے وہ بیشک مومن کے شعر میں موجود ہے ؎ مومن

فردوسی ایک خارجنانِ بیان تھا — گلریز میرے دم سے ہوئی داستانِ تیغ

یہاں بیان کے نون کا اعلان غلط ہے - قبل اسکے کہ میں جواب دوں ایک امر ملحوظ خاطر رہے کہ مومن غدر سے پہلے کے اساتذہ میں سے ہیں آپکو سند بھی انہی استادوں کی چاہیے جو قبل عہدِ مومن یا ہم عہدِ مومن تھے -

غالب مرحوم ؎

مسکن لباس کعبہ علی کے قدم سے جان — نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

بہادر شاہ ظفر کا شعر ہے اور ذوق کے مصرعے ہیں ؎ آبحیات صفحہ ۳۷۴ ملاحظہ ہو ؎

اس خرد نے مجھے سرگشتہ و حیران کیا — کیوں خردمند بنایا نہ بنایا ہوتا کہ

تو نے اپنا مجھے دیوانہ بنایا ہوتا

ذوق مرحوم ؎

پھر روئے پھوٹ پھوٹ کے پاؤں کے آبلے   نالہ سا ایک سوئے بیابان بہہ گیا

میر تقی میر ؎

حالِ زبوں اپنا پوشیدہ کچھ نہ تھا تو   سنتا نہ تھا کہ صید بیجان ہو رہا ہے

آزاد صاحب کا ذاتی اعتراض۔ مومن ؎

دل ایسے شوخ کو مومن نے دے دیا کہ جو ہے   محب حسین کا اور دل رکھے شمر کا سا

فرماتے ہیں کہ شمر بروزن اثر خلافِ لغت ہے۔ بجا ارشاد ہوا مگر ایک کیا ایسے صدہا الفاظ اساتذہ مستند کی زبان پر غلط مروج ہیں۔

دوات کو داوات بنات کو نبات تو عام طور پر بولتے ہیں اور یہی ایسے الفاظ کا رسالہ ازاحۃ الاغلاط مولفہ مولانا ظہیر احسن شوق نیموی اور تصحیح اللغات مولفہ مولوی رفیع احمد صاحب عالی وکیل بدایوں تلامذہ تسلیم کے دیکھنے سے پتہ چلیگا۔ اب جو یہ بحث ہو کہ شعر میں ایسی غلطیوں کو دکھلاؤ تو لو وہ بھی دیکھ لو۔

تسلیم ؎

کچھ تو رہتا اتحادِ جوہرِ قاتل بعد مرگ   کاش آب تیغ بہرِ غسلِ میت مانگتا

یہاں تربت کے وزن پر میت نعتاً غلط ہے۔

اب رہ گیا اک اور اعتراض یعنی اُنکی ترکیبیں اور اضافتیں غیر مانوس ہیں جیسے۔ زبانِ اجابت نشان۔ دمِ خونابہ ریز۔ تیر یار۔ زخم ریز۔ قدم فرسا وغیرہ ان ترکیبوں پر غلط ہونے کا تو اطلاق نہیں ہو سکتا ہے رہ گیا اجتہاد مومن سے اختلاف وہ آپکو اختیار ہے مگر میرے خیال میں انہیں ترکیبوں کے بدولت وہ مومن ہیں ورنہ ذوق سے ہی بدتر اور کمتر سمجھے جاتے۔ انہیں اچھوتی ترکیبوں کے تقلید کی حسرت اک حسرت کو کیا ہزاروں کو ہے مگر معنی آفرینی ہیں کامیابی کسی کو بھی نہیں ؎

فکرے میرے کہاں ہوتا ہے سودا کا جواب　　　ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ اُسی مغفور کا

بس کلیات بھر میں یہی چند غلطیاں بتائی جاتی ہیں جو اور اساتذہ کے مقابلہ میں بالکل نہیں ہونے کے برابر ہیں اور میرا تو یہ مذہب ہے کہ اساتذہ کی غلطی ہم مبتدیوں کیلئے سند ہے

اللہ اللہ خیر سلا مانو کہ نہ مانو ؎ سید انشا

اک طفلِ دبستاں ہو فلاطوں مرے آگے　　　کیا مُنہ ہے ارسطو جو کرے چوں مرے آگے

مرغانِ اُولی اجنحہ مانند کبوتر　　　کرتے ہیں سدا عجز سے غُوں غُوں مرے آگے

خدا کا شکر کہ ابھی غلامانِ غلامِ مومن ہندوستان میں ہیں جو ایسے اعتراضات کو چٹکیوں میں اُڑا دیں ۔ کتاب کی طوالت اور دنیا کی بدمزاقی کے سبب ہر جگہ اختصار سے کام لے رہا ہوں ۔

خواب ۔

وہی خواب جو نئی روشنی والوں کی نگاہ میں بے اصل اور خیالی تصور سے زیادہ نہیں اہلِ باطن کے یہاں منازل اعلیٰ کے طے ہونے کی اک راہِ مستقیم ہے۔ انکا صحیح و غلط ہونا بھی اپنی ضمیر پر ہے ۔

مومن چونکہ اک ولی کے فیضان سے معمور تھے اسلئے نیک خیال والوں کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ جو اشارہ اُن کے طرف سے ہو وہ بے اصل نہیں ۔ چنانچہ ذیل میں ہم اُن کے طرف چند خواب کو منسوب کرتے ہیں ؎ سلام مرحوم

حدیثِ زلف چشمِ یار سے پوچھ　　　درازی رات کی بیمار سے پوچھ

۱ انکی موت سے دو برس بعد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے خواب میں دیکھا کہ قاصد آیا ہے اور مومن کا خط لایا ہے ۔ جسکا مضمون یہ ہے کہ برسات کے سبب میرے عیال پر مکان کے طرف سے بڑی تکلیف ہے اونکی خبر لو ۔ ذیلِ خط میں ایک مہر لگی ہوئی ہے جسمیں لکھا ہوا ہے ۔ آنکھیں کھلیں تو اک کاغذ اپنے ہاتھ میں ہے

پاتے ہیں مگر حرف اُڑ گئے ہیں ۔ ع ۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے ہکہ
شیفتہ فوراً ہی خانصاحب کے مکان پر پہونچتے ہیں اور دریافت کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ چھت بُری طرح سے ٹپک رہی ہے ۔ رات سے ان کے گھر والے بے چین ہیں چنانچہ واپس آکے دو سو روپیہ خانصاحب کے گھر بھجوا دیتے ہیں ۔ یہ کوئی دل سے گھڑا ہوا خواب نہیں ہے بلکہ آج سے پچاسوں برس پہلے آزاد نے بھی لکھا ہے البتہ مومن کے گھر والوں کے بیان اور اُنکے لکھنے میں تھوڑا سا فرق ہے ۔ خیر دعا ہے کہ خدا مومن کو مقامِ محمود عطا فرمائے ۔

۲۔ اُستاد تسلیم مرحوم ہر پنجشنبہ کو مومن و نسیم کے نام فاتحہ دیا کرتے تھے وہ اسی عمل کا قصہ فرماتے تھے جب وہ مثنوی شامِ غریباں لکھ رہے تھے ۔ کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ شب کا وقت ہے میں چراغ جلا کے لکھ رہا ہوں ۔ مومن خاں آئے ہیں پوچھا کہ کیا لکھ رہے ہو سُناؤ میں نے کچھ اشعار مثنوی کے سُنائے ۔ آپ نے فرمایا کہ مطلب سے اسقدر بعد ان شعروں کو یہاں سے نکال دو ۔ اب جو بیدار ہوتے ہیں تو مثنوی پر غور کرتے ہیں اور واقعی چند شعروں کو بے ربط پاتے ہیں ۔ یہانتک کہ آپ نے ان کو نکال دیا ۔

۳۔ اب کہ مومن کو تقریباً اسّی برس ہو چکے میں نے خود خواب دیکھا کہ اپنے خانہ باغ میں شب کو ننگے سر بیٹھا ہوں ۔ اور چاندنی رات ہے ۔ فرش زمین پر بچھا ہوا ہے ۔ کچھ کاغذاتِ غزل میرے سامنے ہیں اور مومن خانصاحب جو اپنی تصویر سے مشابہ ہیں سامنے بیٹھے ہوئے ہیں اُنکے آگے اک گٹھڑی کپڑوں کی کھلی ہوئی ہے اُس میں سے ایک ٹوپی اپنی جیسی کہ پہنتے تھے نکالی اور مجکو پہنا دی ۔ میری آنکھیں کھل گئیں اور اسکے متعلق غور کرتا رہا کچھ سمجھ میں آیا کچھ نہ آیا بہر حال اُنکے مٹتے ہوتے نام کو روشن کرنے کی دھن میں لگ گیا ہوں ۔ خدا انکے فیضان کا سایہ میرے سر پر رکھے

اولادِ مومن :-

سب کچھ خدا نے مجکو دیا عرش بے طلب
دختر کی آرزو نہ تمنا پسر کی ہے

مومن کا جب انتقال ہوا ہے تو انکے صاحبزادے احمد نصیر خاں چھ سات سال کے تھے بعد مومن انکی تعلیم ننہالی رشتہ داروں کے طفیل میں ہوئی۔ آدمی بہت ذہین تھے۔ بارہ برس کی عمر میں حافظ ہوئے۔ اُسوقت کے ایک مشہور عالم مولوی عبد الرب صاحب تھے جنکا وعظ سننے کے ساتھ یہ دہرا دیتے تھے ہزاروں شعر عربی فارسی کے انکو یاد تھے مگر طبیعت موزوں نہ تھی۔ اور اسی سبب سے انکو باپ کے خوانِ نعمت سے جو اصل شئے تھی نہ ملی۔

گورے آدمی سر پر گھونگروالے بال۔ بدن میں ململ کا انگرکھا ہوتا تھا۔ انکو لالٹینوں سے بڑا شوق تھا اپنا دل خوش کرنے کو مختلف رنگ کے شیشوں سے انکو سجاتے تھے اور شب کو روشن کرتے تھے بجود کے ماموں ننھے خانصاحب کے یہاں حالی مرحوم کی اور انکی نشست تھی۔ پچاس برس کی عمر میں دو لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑ کے دنیا سے کوچ کیا

ایک لڑکے کا نام عبد الوہاب تھا جو عربی فارسی کی تعلیم پانے کے بعد فقر کے طرف رجوع ہوئے اور عالم جذب میں دنیا سے چلے گئے۔ میں نے خود مقبرہ ہمایوں کے طرف جنگلوں میں دیکھا تھا مگر یہ نہ جانتا تھا کہ یہ مومن کے پوتے ہیں۔ دوسرے صاحبزادہ کا نام محمد نصیر ہے۔ علمی ذکاوت اور محنت کے سبب تین سال میں انہوں نے فرسٹ ڈیویژن میں انٹرنس پاس کیا۔ عربی فارسی سے بھی باخبر ہیں شعر بھی کچھ کہتے ہیں مگر مزاج وارستہ ہے۔ آخری سفر جو خاکسار عرش نے دہلی کا کیا۔ اُسوقت یہ وہاں موجود نہ تھے۔ بہرحال مومن کی اولاد کو انکے نام کے روشن کرنے کا خیال نہوا۔ اپنے جدِ بزرگوار کو نہ جانا نہ پہچانا۔

احمد نصیر خانصاحب کی صاحبزادی ہنوز موجود ہیں انکا ذکر اپنی جگہ پر آئیگا۔

دختران مومن۔

مومن کا وہ قطعہ صفحات تاریخ میں موجود ہے یعنی ؎

نال کٹنے کے ساتھ مومن نے ۔۔۔ کہی تاریخ دختر مومن ؁۱۲۵۰ھ

یہی وہ صاحبزادی ہیں جنکی اہل اولاد کے بدولت آج یہ تذکرہ مالا مال ہے۔ بعض غیر محقق تاریخ نویس ایسے بھی ہیں جنہوں نے رسالہ نگار لکھنؤ کے مومن نمبر میں ایک جگہ کہا ہے کہ مومن کی لڑکی کا چار سال بعد انتقال ہوگیا تھا اور سند میں یہ مومن کا قطعہ پیش کر دیا ہے ؎

خاک بر فرق دولت دنیا ۔۔۔ من نشانم خزانہ بر سر خاک

صرف کتابوں کو دیکھ کے گھر بیٹھے خیالی گھوڑے دوڑانا اور بات ہے اور گھر سے نکل کے تحقیق کرنا اور چیز ہے بہرحال وہ دوسری صاحبزادی مومن کی تھیں جو بعالم شیر خوارگی انتقال کر گئیں اور وہ لڑکی جسکے متعلق دختر مومن والا قطعہ ہے وہ مومن کے بہت بعد غازی پور زمنیہ میں مولوی عبد الغنی مرحوم وکیل ضلع سیتاپور سے بیاہی گئیں۔ مولوی عبد الغنی مرحوم جنکا ذکر آگے آچکا ہے یہ حضرت مولانا محمد فصیح بانی سلسلہ فصیحی کے صاحبزادے تھے۔ (غنی صاحب کے ایک اور بھائی مولانا محمد امانت اللہ صاحب مشہور واعظ گذرے ہیں جو میرے والد مغفور کے بڑے محترم دوستوں میں تھے۔ اور وہ جب گیا میں تشریف لاتے تھے تو میرے مہمان ہوتے تھے۔ افسوس انکا بھی وصال

؁۱۳۱۲ھ مولوی صاحب نے خود انکے انتقال کی تاریخ لکھی ہے جو سر مزار موجود ہے ؎

اے غنی مصرع تاریخ سر قبر نویس ۔۔۔ بسوئے ملک عدم ہمنفس و ہمدم رفت

اسم گرامی اُن کا منشی بندہ علی تھا وہ گیا کے سربر آوردہ رئیس اور وکیل تھے انہوں نے اپنی عمر کا سارا حصہ اہل اللہ کی خدمت اور زیارت میں گذارا۔

ہوگیا اب انکی ممتاز اولاد میں خان بہادر شمس العلما مولانا ابوالخیر صاحب ریاست گوالیار میں ہیں) مختصر یہ کہ یہ حضرات صاحب سجادہ ہیں اور چونکہ مومن کی بی بی خود ناصری سجادہ اور خواجہ میر درد کے گھرانے کی تھیں نیز مومن خانصاحب خود سادات علوی سے تھے اسلئے ان مرحومہ کی شادی غازی پور میں ہوئی۔ مومن کی انہیں صاحبزادی کی اولاد میں ناصر حبیب صاحب وکیل ہیں۔ نواب مومن کے نواسے کا حال سنو۔

ناصر صاحب ننہال میں یعنی دہلی میں پیدا ہوئے نشو ونما ضلع سیتاپور اودھ میں پائی علوم عربیہ و فارسیہ کے ماہر ہیں۔ انگریزی بھی جانتے ہیں وجاہت ظاہری یہ کہ آپ ایک نامی وکیل ہیں۔ اور بڑی بات تو یہ کہ ماہر فن شاعر ہیں۔ اور آج خاندان مومن کے واحد چشم و چراغ ہیں۔ جب گوالیار کی آب و ہوا آپکے موافق نہ ہوئی تو آپ نے ریاست دتیا کو ممتاز فرمایا۔ جو بالکل کوردہ ہے چنانچہ خود فرماتے ہیں کہ ؎

کون ہے آگاہ میری قدر و قیمت سے یہاں — ایک گنج مایہ ہوں لیکن میں ویرانے میں ہوں

ناصر صاحب کا حلیہ مبارک ملاحظہ ہو۔

گورا رنگ۔ سڈول اعضا۔ خاندانی انداز کے موجب بہت کشیدہ قامت و جثہ سفید نورانی داڑھی۔ سادے کپڑوں سے شوق ہے۔

آپکی شادی بھی ناصر وزیر صاحب سجادہ نشین خواجہ میر درد کی لڑکی سے ہوئی۔ اولاد میں صرف دو صاحبزادیاں ہیں جنمیں سے ایک جنکا نام کنیز فاطمہ بیگم ہے راقم آثم کو بھائی کہتی ہیں۔ اور حالات خاندانی سے سرفراز فرماتی رہی ہیں کیونکہ بوجہ پیری ناصر صاحب نے لکھنا پڑھنا بند کر دیا صحت بھی خراب ہے اور عمر بھی چھیاسٹھ سال کی ہوگئی۔ حافظ خیرآبادی کی حیات تک مشغلہ انکی شاعری کا تھا انکی وفات کے بعد یہ شغل بھی جاتا رہا۔ سچ ہے ع مزا اس زندگانی کا بہار دوستاں تک ہے۔

فراق صاحب کا شکریہ جنہوں نے آجتک ایسے باخبر شخص کا پتہ تک نہ دیا ۔

لیا ہے عرشِ معلّےٰ پہ شورِ نالوں کا
خدا بھلا کرے آملہ دینے والوں کا

میں دست بدعا ہوں کہ حضرت مولانا ناصر تا بہ ابد زندہ سلامت رہیں مگر افسوس کے ساتھ یہ شکایت ہے کہ احوالِ مومن سے آجتک بے خبر رہے۔

کلامِ ناصر نواسۂ مومن۔

کیفِ چشمِ مست سے چھائی ہے ایسی بیخودی
بے پیے مدہوش ہوں ہر وقت میخانے میں ہوں

سب کو گردش ہے مری تقدیر کو گردش نہیں
دورِ عالم میں ہمیشہ ایک پیمانے میں ہوں

زبان ملاحظہ ہو ۔

دیکھ کر ناصر کی صورت بزم میں کہنے لگے
سایہ سا پیچھے پڑا ہے دور ہوتا ہی نہیں

زمین ہے مدعی اپنی عدو ہے آسماں اپنا
بسر ہوگی کہاں اپنی گذر ہوگا کہاں اپنا

یوں نکالی حسرتِ دل عالمِ خاموش میں
لے لیا میرے تصور نے اُنہیں آغوش میں

کون کہتا ہے شبِ ہجر نے سونے نہ دیا
طالعِ خفتہ نے بیدار ہی ہونے نہ دیا

المدد جوششِ جنوں موسمِ گل آپہونچا
آج زنجیر گرانبار کے ٹکڑے کر دے

لکھنؤ کے ایک پامال زمین میں مضمون کی بہار دیکھئے ۔

چُھپایا جان دیکر راز تیرے جورِ پنہاں کا
کیا ہم نے رگِ جاں سے رفو چاکِ گریباں کا

ہماری تیرہ بختی دیکھکر کیا کیا کٹے ہیں جی میں
ذرا سامنہ نکل آیا ستاکر شامِ ہجراں کا

تجھے دھوکا ہے میری خاکِ دامنگیر کیا میں نے
لیا ہے ناتوانی سے سہارا تیرے داماں کا

خاندانی سجادگی کا اثر ملاحظہ ہو ۔

ہوش ہی میرے اُڑ گئے عقل بھی میری کھو گئی
جب سے وہ شکل دیکھ لی آئینہ مجاز میں

یہ چند شعر عہدِ شباب کے ہیں ۔ جب مضطر اور اُنکا دوستانہ تھا ۔ یہ وہی مضطر ہیں جو امیر کی شاگردی سے منکر ہو گئے تھے اور گوالیار میں جج تھے ۔

ادا کے ناز کے انداز کے کرشمے کے
جدا جدا مرے سینے میں ہیں نشان باقی

شباب آتے ہی بچپن پہ اُنکے لوٹ گئیں
رہی سہی بھی جو بچپن کی شوخیاں باقی

جو تیر آتا ہے اُنکا وہ ڈھونڈھتا ہے یہی
کہ دردِ عشق سے دل میں کہاں کہاں باقی

رباعی

کیونکر یہ کہوں کسی سے اچھا ہوں میں
میں آپ سمجھتا ہوں کہ جیسا ہوں میں

لیکن مجھے کیوں نہ فخر ہو اے ناصر
جب حضرتِ مومن کا نواسا ہوں میں

دیوان انکا عرصہ سے تیار ہے مگر مذاق دنیا کا بدل گیا کیا چھپوائیں۔ آج مومن کا کوئی قدر داں نہیں اُنکے نواسے کا کیا ذکر۔ پرانے گلدستوں میں بھی کلام آپکا ہے مومن کے اک اور عزیز ہے عرش

تیرے منہ میں ہے زبانِ مومن
تجھے روشن ہے بیانِ مومن

مرحبا صل علے کیا کہنا ہے
تجھ میں پاتا ہوں میں شانِ مومن

دنیائے ادب کے فضا میں مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی بی۔ اے۔ رجسٹرار ہائی کورٹ حیدر آباد کو کون نہیں جانتا ہے۔ اور دلی میں اس پایہ کا ادیب کون ہے۔ مومن خانصاحب سے آپکا بھی رشتہ ہے یعنی مومن آپکی دادی صاحبہ کے بھائی تھے۔ آپکو غالب کے خاندان سے بھی تعلق ہے۔ جیسے کہ آپکے جادو نگار قلم سے ۱۲۶۱ء میں دھلی کا ایک مشاعرہ۔ رسالہ اُردو دکن میں نکلا ہے۔ اور مضامین فرحت نام ایک کتاب بھی چھپی ہے نیز تصویرِ مومن سے اک عالم کو ممنون کیا ہے ہندوستان میں انکا ڈنکا بج رہا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد اور محسن الملک آج ہوتے تو پتہ چلتا خیر یہ کہتے ہیں کہ مجکو فنِ شعر سے تعلق نہیں صرف نثر لکھ لیتا ہوں مگر میں نہیں مان سکتا ہے

رہ پر اُنکو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل جائینگے دو چار ملاقاتوں میں

خاکسار عرش نے کلیات اپنا ریویو کیلئے حضرت کی خدمت میں بھیجا تھا اور لکھا

کہ آپ مومن کی بہترین یادگار ہیں اسکو بنظر اصلاح دیکھئے اور اپنی رائے سے مطلع کیجیے چنانچہ اُسکی یہ رسید ہے۔

حیدر آباد دکن ۔۔۔۔۔۔ ۴ دسمبر سنہ ۱۹۲۸ء

"آپکا دیوان میں نے دیکھا اور اچھی طرح دیکھا۔ میں نہ تو شاعر ہوں نہ سخن فہم۔ دہلی کا رہنے والا ہوں اسلئے زبان کا لطف اُٹھا سکتا ہوں۔ آپکے خط اور دیوان کی جو زبان ہے اگر یہی زبان بہار اور بنگالہ میں بولی جاتی ہے تو دہلی اور لکھنو والوں کو ذرا سوچ سمجھکر زباندانی کا دعویٰ کرنا چاہیئے واقعی آپ لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں حال اچھا ہے قدردان نہیں"

مارچ سنہ ۱۹۲۹ میں عرش کا سفرِ دہلی

اب کہاں شوکت و شانِ دہلی ۔۔۔۔۔۔ مِٹ گیا نام و نشانِ دہلی

نکلتے جاڑوں کے دن ہیں۔ دوپہر سے پہلے دھوپ میں گرمی آجاتی ہے پٹنہ شہر سے شام کے وقت کوئی پانچ بجے ہونگے میں اسٹیشن نئی دہلی سے اتر کے قطب کو جا رہا ہوں اس سفر میں میرے عزیز میاں محمد کریم اور میرے اللہ کا صلاح الدین احمد عرش ج

پیر و مرشد سے اب کہاں تسلیم اگلی شاعری ؎ مر مٹے وہ لوگ ہی جنکے لئے
آپ جو کچھ رقم فرماتے ہیں دل بہلاتے ہیں ورنہ میں آپکے بزرگوں اور آپکا کفش بردار ہوں۔ رہی قدردانی اسکے لئے دربار داری شرط ہے جو مومن کیطرح میرے حصہ میں نہیں آئی بفضلہ دیوان میرا امرا کی مدح سے پاک ہے خدا آپکو زندہ سلامت رکھے سنا بہت جی خوش ہوا حالی ہے بلکہ ابھی کچھ لوگ باقی رہ رہے ہیں۔ لیجئے آج حیات مومن جسکا عرصہ سے ہم لوگوں میں چرچا تھا حاضر ہے ہم ہوے تم ہوے کہ میر ہوے سب اسکی زلفوں کے سب اسیر ہوئے
خاکسار عرش کے اس لڑکے کی عمر اٹھارہ سال کی ہے مگر طبیعت موزوں رکھتا ہے یہ اشعار اسکے ہیں

دامن بچا کے رہنا آئے نہ داغ کوئی ۔۔۔۔۔۔ یہ خاکدانِ عالم کاجل کی کوٹھری ہے
سیرِ بہارِ قدرت کر تو خزاں میں غافل ۔۔۔۔۔۔ پتے ہیں خشک لیکن شاخِ چمن ہری ہے

بھی شامل ہے۔ ایکے یہہ تصور ہے کہ جتنا پورا ہو یہ پرانی دلی کے ٹوٹے ہوئے
ملکے کچھہ مومن کے حالات معلوم کروں۔ تو غروب آفتاب سے پہلے درگاہ شریف
میں آگیا چونکہ بعد مغرب آستانہ شریف بند ہوجاتا ہے۔ اسلئے تازہ وضو کے
ساتھہ پہلے جانشین ہندالولی۔ یعنی حضرت قطب الدین بختیار کاکی ؒ کے مزار اقدس
پر حاضر ہوا۔ اور فاتحہ پڑھنے کے بعد نماز مغرب اور ضروری کاموں سے فرصت پائی
اب سہانی رات ہے اور خاموش چاندنی چادر گور بنکر بیکسوں کے مزاروں پر پڑی
ہوئی ہے۔ میں سماع خانہ میں لیٹا ہوا سوچ رہا ہوں کہ خدایا وہ کیا مبارک وقت تہا،
اور وہ کیسے مبارک بندے تہے جنکی روحانی قوت نے اسلام کو پھیلایا اور اس درخت کی
جڑکو مضبوط کیا۔ تہوڑی دیر کے بعد آنکہہ لگ گئی اور سوگیا جانیں وہ کیسی نیند تہی کہ ایک ہی
کروٹ میں صبح ہوگئی اور اذان کی آواز کانوں میں آئی۔ اٹھہ بیٹھا ضروریات اور نماز سے
فرصت پاکے پہلے حضرت مولانا فخر ؒ پہر قطب صاحب کے مزار اقدس پر حاضر ہوا۔ اور اسکے
بعد حضرت مولانا عبدالحق ؒ اور اولیا مسجد حوض شمسی۔ حضرت نجیب الدین فردوسی ؒ (کہ مخدوم الملک
بہاری کے پیر تہے) وغیرہ کے مزارات پر ہوکے قطب مینار کی طرف چلا گیا نیز مقبرہ شمس الدین
التمش میں کچھہ دیر ٹھہرا اور اس بادشاہ کو قطب صاحب کے خلیفہ ہونے کے سبب اک عارفانہ
کی نگاہ سے دیکھتا اور یاد کرتا رہا اللہ اللہ اس شخص کا یہ رتبہ تہا کہ اسنے نماز حضرت کے جنازہ
کی پڑھائی تہی۔ اور آپکی کفش برداری کو فخر جانتا تہا۔

حافظ اینجا بادب باش کہ سلطان و ملک ہمہ در بندگی حضرت درویشان است

غرض تین دن قیام خاکسار کا یہاں رہا پرانی دلی کی گلیوں کی خوب خاک چہانی ایک شخص
بہی نہ ملا جسکو علم ادب سے دلچسپی ہو یا مومن کے نام تک سے آشنا ہو۔ افسوس مردان تمام
شدند و ملک خدا خر گرفت۔ آخر طبیعت گھبرا گئی۔ اور وہاں سے نکل پڑا شاہ نظام الدین ؒ
اور حضرت امیر خسرو کی زیارت سے مشرف ہوتا ہوا غالب کے اُجڑے مزار پر آنسو بہاتا ہوا۔

مقبرہ ہمایوں آٹھرا۔ اس مقبرہ کا اندرونی حصہ آگے صاف کرایا گیا تھا اب پھر میلا ہو گیا ہے اور
جانے آنے کے قابل نہیں ہے یہاں ہی طبیعت کو وحشت ہوئی اور اب سیدہا مہدیوں
میں مزارِ مومن پر آیا۔ ٹھیک انکے مزار کے پائینتی ایک نیا مزار بن گیا ہے جسپر یہ کتبہ ہے
(حاجی عبدالعزیز بعمر سال ۱۴ ذیقعد ۲۴ ۱۳۶۳ھ یوم چہارشنبہ بوقت فجر رحلت نمود)
اسکے دیکھنے سے مجھے تشویش ہے کہ اب مومن کے خام مزار پر بھی کسی اور کی قبر نہ بن جائے
آہ کیا کروں۔ انکے عزیزوں کو ابھی تک توجہ نہیں مجھے پہلے اس تاریخ کی پڑی ہے چھپ
لے تو ادھر سخ کروں مگر ؎

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک

غرض مومن کے مزار پر فاتحہ پڑھنے اور آنسو بہانے کے بعد میں فتحپوری کے اک ہوٹل
میں چلا آیا۔ دوسرے دن آہی مرحوم کے پھوپھی زاد بھائی میر جمال الدین صاحب
مالک آئیرن ورکس دہلی۔ سے ملنے کو چوڑی والان میں گیا وہاں پہنچ چلا کہ قرول
باغ میں اجمل خانی طبیہ کالج کے آلات کے نمایش کا جلسہ ہے۔ وہ ہی وہیں گئے
ہوئے ہیں میر صاحب آگے ہندوستانی دواخانہ دہلی کے منیجر بھی تھے۔ غرض
بڑی پریشانی کے بعد وہاں پہونچا۔ دوپہر ہو گئی ہے دھوپ کی شدت
اور پریشانیوں کے سبب تشنگی غالب ہے۔ قرول باغ کے گرد صحرائے
وحشتناک میں ہر بگولہ دیو سا نظر آرہا ہے۔ پتے ہوائے گرم کے ساتھ سایہ کی تلاش میں
ادہر اُدہر دوڑتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ مگر بیت جھڑ کے سبب درخت خود لٹے ہوئے مسافر
کے طرح خالی ہاتھ کھڑے ہیں۔ پناہ کون دے۔ قرول باغ کی نادر عمارتوں میں ڈھونڈھتا
ہوا مہمان خانہ کے طرف نکل گیا وہاں میر صاحب قبلہ ملے ضعیف و ناتوان۔ گورے
آدمی۔ مختصر سی سفید داڑھی۔ کھدر کی شیروانی۔ اور گاندھی کی ایجاد کردہ
ٹوپی تھی۔ یہ مجھ دور افتادہ کیساتھ بہت خاطر پیش آئے کھانا ہی کھلایا اور برف کا پانی

بھی بلایا۔ مگر چونکہ مصروف تھے اسلئے باتیں نہ کرسکے دوسرے دن پھر اسکو اُٹھا رکھا ہیں اُنکے حکم کے بموجب دریا گنج کے کارخانہ میں شام کو گیا وہ مجھے مومن خانصاحب کی پوتی عزیز بیگم صاحبہ کے پاس کوچہ چیلاں میں لائے۔ پردہ کرایا گیا۔ عزیز بیگم صاحبہ نے میری خدمتوں کا حال سنکر بہت کچھ شکریہ ادا کیا میں نے اپنا دیوان اور رسالہ نگار جس میں مومن کی تصویر تھی اُنکی خدمت میں پیش کیا۔ وہ اپنے جد بزرگوار کی تصویر کو دیکھ کے رونے لگیں آزاد کی حق تلفیوں پر اظہارِ نفرت کرتے ہوئے تاریخ مومن کو جا بجا سنا او بہت خوش ہوئیں۔ پھر یہ کہا کہ جو حق ہملوگوں کا تھا وہ آپنے ادا فرمایا خیر خدا آپکو جزائے خیر دے۔ مزار مومن کی درستی کا ذکر آیا فرمانے لگیں کہ اخراجات کا انتظام کر دیجیے میں بنوا دونگی۔ پھر اپنی پریشانیوں اور فراق صاحب کا حال فرمانے لگیں یہ بھی کہا کہ میرے پاس جو کچھ نانہالی جائداد ضلع شاہ آباد آرہ میں تھی اور جسکو لوگ لوٹ رہے تھے۔ اسکو تنگ آکے میں نے بیچ ڈالا۔ پھر اسپر اظہار افسوس فرمایا کہ آپ ایسے موقع پر تشریف لائے ہیں ہمارے بھائی موجود نہیں ہیں۔ بہرحال کم سے کم ایک وقت آپ روٹی ہمارے یہاں کھائیں۔

میں نے دست بستہ عرض کیا کہ اب وقت نہیں کہ میں زیادہ دلّی میں ٹھہروں۔ ورنہ عذر نہ تھا اس کے بعد چند دریافت طلب باتیں کیں جنکا ذکر جا بجا تذکرہ میں کیا گیا ہے میر جمال الدین صاحب بھی اخیر وقت تک از راہِ کرم باوجود مصروفیت میرے ساتھ رہے۔ ہر چند مجھے یہ علم ہوا کہ فراق صاحب اچھے ہیں بیمار نہیں مگر انکی دلخراش تحریر نے محرومِ ملاقات رکھا۔ دوسرے دن بیخود صاحب کے طرف گیا وہاں بھی مومن خاں صاحب کا ذکر رہا۔ وہ افسوس کے ساتھ یہ فرماتے رہے کہ میں نے کیا میرے والد نے بھی جو زندہ ہیں انکو نہیں دیکھا۔ بہرحال بیخود صاحب تواضع تکریم سے پیش آئے اور اپنے یہ اشعار بھی سنائے جو حوالہ قلم کرتا ہوں

بیخود صاحب بہ لحاظ عمر و صحت اب چراغ سحری ہیں۔ اور انکے بعد دلی یقیناً خالی ہو جائیگی۔

کلام بیخود

میری تربت میں نکیرین نہ آنے پائیں ۔۔۔ کل بھی تکلیف ذرا لے شب ہجراں کرنا
زباں ہو داغ کی بیخود تو ہو مضموں مومن کا ۔۔۔ بیاں غالب کا ہو اشعار کی وہ شان پیدا کر

اس صحبت کے بعد اور چند حضرات سے بہ سلسلۂ تاریخ مومن ملا۔ اور اس کے بعد میں آستانہ حضرت مولانا شاہ محمد فاق رح میں حضرت مولانا فضل رحمٰن رح گنج مرادآبادی کے پیر تھے اور مجھکو اسی سلسلہ میں بیعت ہی چلا آیا۔ اور حضرت شاہ سعید الزبیر صاحب مدظلہ کی صحبت سے سبزی منڈی میں فیضیاب ہوا

اور اسکے بعد دہلی کو نگاہ حسرت سے دیکھ کے روانہ ہو گیا ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے ۔۔۔ بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

دلی کی نہ اب وہ شان ہے نہ زبان ہے۔ وضع تک بدل گئی اخلاق تک بدل گیا صرف چند پرانے گھرانے ہیں بس اُنہیں کے دم تک اور ضعیف العمر بیگموں کی حیات تک دلی دلی ہے چنانچہ ہمسے بہت پہلے داغ نے ہی اسکا فیصلہ کر دیا ہے ؎

بھیسی پہلے اُڑاتے تھے زبانِ دہلی ۔۔۔ لے گئے لوٹ کے سب شوکت شان دہلی

عزیز بیگم صاحبہ کی زبان بہت پاکیزہ اور صاف ہے انکے خطوط بھی اکثر آیا کرتے ہیں، و باللہ التوفیق۔

تنقید کلام مومن

زمانہ قدیم سے گرچہ یہ اک اصول چلا آتا ہے کہ ایک شاعر کا کلام دوسرے کے سامنے لا کے یہ کہلایا جائے کہ کون کس سے بڑھا ہوا ہے تو

فقیر عرش حضرت عاشق علی عرف مستان شاہ صاحب مدظلہ کمل پوش خلیفہ حضرت مولانا فضل رحمٰن کے مرید ہیں عمر شریف انکی تقریباً ۹۰ سال کی ہو گی تجرد اور سیاحی میں ہمیشہ بسر فرماتے ہیں۔ ذکر قلبی ہر وقت انکے قلب پاک سے جاری ہے۔

میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس سے کوئی نتیجہ بجز جنگ اور تعصب کے نہیں نکلتا بلکہ اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ شعرا کے دقیق کلام کی تشریح کی جائے کہ وہ عام فہم ہونے کے قابل ہوں

بھلا تردد بیجا سے اسمیں کیا حاصل اُٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

بالفرض کہ مومن خاں۔ خاقانی۔ ظہوری۔ انوری سب سے بہتر تھے تو اس سے کیا ہوا کریں۔ سوال تو یہ ہے کہ اُنکا کلام میرے سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ اسلئے ہمنے تنقید کے طرف زیادہ رخ نہ کیا بلکہ تشریح کلام مومن کی طرف رخ کیا۔ اور اُس معاملہ میں بھی نکتہ چینیوں سے یہ التماس ہے کہ وہ بعوض اسکے کے میری رائے پر تردید پیش کریں ازراہِ کرم اپنی ذاتی محنت سے کام لیں دُنیا کو اختیار ہے وہ جسکو پسند کرے۔ وقت ضایع کرنے اور اخبارات میں مضامین لکھنے سے تو میرے خیال میں یہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بہرحال اب میں اُس بلند پایہ شاعر کے کلام کی تشریح اور اختصار کے ساتھہ تنقید شروع کرتا ہوں کہ تذکرہ میں تا بہ امکان کوئی کمی رہ نہ جائے۔

قصاید۔

چونکہ جناب ضیاؔ بدایونی نے مومن کے قصاید کلیات سے علیحدہ کرکے چھپوائے ہیں اور جابجا تشریح بھی کی ہے اسلئے مجکو اسکے طرف زیادہ رخ کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ دوسرے آج قصاید کی قدردانی دنیا میں کہاں ہے کہ میں چند صفحات سیاہ بھی کروں اور لوگ اُسکو دیکھیں

وہ دن گئے کہ رباعی پہ اشرفی پاؤں کہ اب قصیدے پہ ملتا ہے اک چھدام نہیں۔

بہرحال پھر بھی میں اسکے طرف رخ کرتا ہوں کہ اس مذاق والوں کو بھی گونہ دلچسپی ہو۔

سوداؔ بہترین قصیدہ گو اُردو کے تہے اور اُنکے بعد ذوقؔ کا نمبر ہے۔ ان لوگوں نے زورِ شور طبیعت کا جو اس فن میں دکہایا اُسکا سبب یہ تہا کہ قصیدہ گوئی اُنکا ذریعہ معاش تہا۔ مومن کے قصاید اگر اُنکے مقابلے میں کم رتبہ ٹہرائے بہی جائیں تو یہ سمجہ لینا ہوگا کہ مومن نے ایک بازی شطرنج کی نہ کہیلی کوئی قصیدہ لکہہ لیا، پہر یہ بہی کہ علمی خصوصیتیں جہانتک کہ انکے قصاید میں ہیں وہ سوداؔ۔ وذوقؔ یا کسی اور کو نصیب نہیں بعض قصاید میں انکی عالمانہ و فاضلانہ شان اُن عربی ٹکڑوں سے اور بہی ظاہر ہوتی ہے جسکے قریب تک بجز انشا کوئی اُردو کا شاعر نہیں گیا۔ ان تمامی معاملات کو مدّ نظر رکہہ کے انکی بے طلبی کو نگاہِ قدر سے دیکہہ کے یہ ماننا پڑیگا کہ یہ اپنے عہد کے عرفی۔ اُنوری، فردوسی ضرور تہے۔

قصیدہ در حمدِ باری تعالےٰ

۱ الحمد لواہب العطایا	اس شور نے کیا مزا چکہایا
۲ والشکر لصانع البریۃ	جسنے ہمیں آدمی بنایا
۳ احسان ہیں اوسکے کیا گرانبار	سر شیخ شداد کا جہکایا
۴ کیا پایۂ منتِ سلیمان	اک بات میں تخت پر بٹہایا

۱ یعنی لفظی سے تو صرف کام چلنے کا نہیں اسلئے مطلب سے کام لیتا ہوں ؎

میرے شعروں میں کہاں معنیٔ لفظی تسلیم ۔ یہ تو کیفیتِ دل ہے کہ بیان ہوتی ہے

اس شعر میں صرف عطا جان ہے۔ مقصد یہ ہے کہ تعریف اُس بخشش کرنے والے کی نہیں ہوسکتی۔ اور اُسکے عطاؤں کے شور نے وہ مزا چکہا رکہا ہے کہ کچہہ دل ہی جانتا ہے، سچ تو یہ ہے کہ انسان کی اک حقیقت مٹی اُسکی عطاؤں سے مالامال ہوئی، اور انہیں عطاؤں کے بدولت اُسکو خطاؤں سے بہی نجات ہوئی، دوسرا پہلو یہ بہی ہے کہ اگر انسان میں خطا مضمر نہوتی تو اُسکی عطائیں جلوہ گر نہوتیں ؎

موقوف جرم ہی پر عطا کا ظہور تھا   بندے اگر قصور نہ کرتے قصور تھا

خداوندِ عالم نے قرآن پاک کو الحمد کے لفظ سے شروع فرمایا ہے اسلئے بھی انہوں نے اُسی لفظ سے اُسکی حمد شروع کی ہے۔ دوسرے مصرعے میں نمک کے مقابلے میں مزا کا لفظ عجب مزا دے رہا ہے اور شعرا اس صنعت کو مراعاۃ النظیر کہتے ہیں۔

ہزار شکر اُس صانع حقیقی کا (جسکی ذات ہر شکل وصنعت سے مبّرا ہے) کہ اُسنے بجائے وحوش وطیور کے مجکو انسان بنایا اور اس ذریعہ سے اُسنے میرے مراتب کو فرشتوں سے بھی زیادہ بلند کیا۔ یعنی ؎

بنایا آدمی کو ذوق ایک جزوِ ضعیف   اور اُس ضعیف سے کُل کام دو جہاں کے لئے

سے احسان اور اُسکا احسان کوئی معمولی وزن نہیں رکھتا کہ آدمی اُسکو سر پر اُٹھالے۔ دیکھو آسمانوں کو جنپر اُسکی عطیہ رفعت کا احسان ہے اور یہ اسی کی گرانباری ہے جسنے اُنکے سروں کو جھکا رکھا ہے، اور ہر گوشہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خاک پہ سر بسجود ہو رہا ہے۔

کہ یہ شعر معنی کے لحاظ سے کچھ بھی نہیں مگر مطلب کے لحاظ سے بہت بلند ہے مگر جب تک تم ان دو باتوں کو نہ جانوگے۔ نہ مانوگے۔ سلیمان کون تھے۔ تخت سلیمان کی حقیقت کیا تھی جواب سے حضرت سلیمان ایک میرے ہی جیسے انسان پیدا ہوئے تھے۔ مگر اُنکو خداوندِ عالم نے پیغمبری عطا کی اور اس پایہ کی پیغمبری عطا کی کہ وہ انسان کُل جانوران آبی و دشتی کی بولی سمجھتے تھے، جن و پری و شیاطین تک اُنکے تابع تھے۔ اُنکو سلطنت وہ بخشی کہ جسکے مطبخ میں غلہ تو غلہ ستر ہزار اونٹ پر روزانہ نمک آتا تھا اور خرچ ہو جاتا تھا خیال کرو کہ کتنی مخلوق روز کھانا کھاتی ہوگی۔

سے اب تخت کی حقیقت سنو کہ ہر بادشاہ روئے زمین کو اُس شہنشاہ دوجہاں نے صرف اتنا بڑا تخت دیا کہ وہ عافیت کے ساتھ بیٹھ سکے انکو وہ تخت دیا جسپر بارہ ہزار تک کرسیاں

بیٹھتے تھے۔ اور ہوا کے دم پر ایک روز میں ایک مہینہ کی راہ طے کرتا تھا۔

اب مطلب کی طرف آسانی سے تُم خود جھک سکتے ہو کہ ان عطیات کے ساتھہ جنکا کہ ذکر آ چکا جو ہما او ند تعالیٰ نے اک بات میں یعنی یک لمحہ میں ایسے تخت پر انکو بیٹھا دیا اسکے مقابلہ میں سلیمان علیہ السلام کا شکریہ یعنی ربنا ہک یوا کوئی چیز ہے۔ سہ

سبحان اللہ چہ نکتہ دانیست　　یک حرفِ طلسم صد معانیست

دنیا کے بابصیرت نقادِ فن اگر اسی طرح تشریح کلام مومن فرماویں تو میرے خیال میں اُس تنقید سے جسکا کہ ذکر کر چکا ہوں کہیں بہتر ہے۔

قصیدہ در نعت سرور کائنات

اے محرمِ خلوتی کہ آنجا　　محو است نشانِ آفرینش

نعت کا قصیدہ جو مومن نے لکھا ہے اُسکی تمہید بہاریہ ہے۔ اُسکے دو شعروں پر بیتر کا اکتفا کرتا ہوں۔

۱ زہے تریب صفا خاک بیز ہی گلچیں　　پڑے جو وصفِ گلزار میں گلوں کے عکوس

۲ ہجوم سبزہ نے کی بسکہ رنگ آمیزی　　زمین پہ چادرِ مہتاب بن گئی ہے سدوس

فریبِ صفا۔ اور خاک بیز۔ انہیں دو لفظوں پر شعر کا وجود قائم ہے خیر میں اپنے مطلب سے مطلب رکھتا ہوں۔ یعنی آگے لکھ چکا ہوں کہ ڈکشنری لکھنے نہیں بیٹھا۔ مطلب کو بیان کر کے شعر کا حُسن دکھلانا میرا کام ہے۔ وہ سنو۔ کہتے ہیں کہ زمین گلشن کچھ اسقدر صاف اور شفاف ہے کہ اوسپر آئینہ کا گمان ہے اب جو وہ آئینہ ہے تو گویا ئے باغ کا عکس بھی اُسپر پڑ رہا ہے۔ جب عکس بھی پڑ رہا ہے تو گلچیں فریب صفا کے دھوکے میں آ کے اصل پھولوں کے طرف تو ہاتھہ نہیں بڑھاتا ہے۔ زمین پر عکس کے طرف ہاتھہ بڑھا دیتا ہے۔ آئے سبحان اللہ سبحان اللہ۔ کیا صفائی چمن کی تعریف ناظرین نے اس سے بھی اچھی کبھی

شنی۔ ایسا لطیف پیرایہ بھی اُنہے کہیں نظر آیا۔ نہیں اور ہرگز نہیں۔
ہجوم سبزہ ہومن خانی انداز ہے جسکو کسی اور نے کا ہیکو پایا ہوگا۔ سندرس
سبز چادر کو کہتے ہیں اب مطالب سنو۔ سبزہ کی کثرت نے اُس چادر نور کو جو سفید
چاندنی کے طرح چمن میں بچھی ہوئی تہی اپنے پرتو سے ہرا کر دیا ہے۔ اور اب
چاندنو سفید ہے مگر چاندنی سبز ہے جسطرح شمع جلا کے کوئی شمعدان پر سبز
کنول رکھہ دے تو شمع کی تو اپنی صورت یہ رہتی ہے مگر سفید چاندنی کا فرش
سبز ہو جاتا ہے وہی عالم چمن کا شب کو نظر آرہا ہے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔
اب اُمرا کی شان میں جو قصاید لکھے گئے اُنہیں سے بھی دو چار شعروں کو ملاحظہ فرمائے

قصیدہ در مدح والئے پٹیالہ

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری — کثرت دُود سے سیہ شعلۂ شمع خاوری
فیل نشیں بنادیا خاک نشین کو اُسنے اب — خاک نہیں فلک کو زیب لاف گزاف برتری
لیتے ہوئے گرائے جو بار عطا سے لعل و دُر — کلبۂ خاکروب ہو جیسے دوکان جوہری

یہ مطلع اُنکے ان حاسدوں کے طرف مخاطب ہے جو اس انعام فیل پر رشک کر رہے تہے۔
وہ یہ کہتے ہیں کہ بہی اگر صبح ہوگی تو اُس سے کیا میری تیرہ اختری یعنی قسمت کے
ستارے کی تاریکی تو بدستور رہے۔ اور تاریکی کا ہیکو دھواں کہو جسنے آفتاب کے
شعلہ کو بہی گہیر کے سیاہ کر رکہا ہے اور اب اُسکی شعاعوں کا کہیں نشان بہی
نہیں ہے۔ اک نکتہ خاص اور بہی ہے کہ انعام میں اگر زر و جواہر ملتا تو اُمید
ہوتی کہ قسمت کا ستارہ اک روز چمکیگا۔ ہاتھی کا رنگ چونکہ سیاہ ہے
اسلیئے اس انعام سے بہی تیرہ اختری کا فال نکلتا ہے۔
مجھہ خاکنشین کو ممدوح نے فیل نشین بنادیا یہ عنایت اُسکی ہیں ایسی صورت
میں اب میرے آگے فلک کا دعوائے برتری فضول ہے۔ معلوم ہوتا ہے

کہ اول اول جب یہ ہاتھی پر بٹھائے گئے ہیں تو آسمان کی طرف دیکھ کے یہی شعر کہا ہے۔ اب مکان چلے جا رہے ہیں اور انگلیوں کی کنگھی زلفوں میں کرتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں کہ

خاک نہیں فلک کو زیب لاف و گزاف برتری

حاسد جل رہے ہیں اور تماشائی گر رہے پڑتے ہیں۔ لگاؤ لے خاک نشین اور فیل نشین کی ترکیب پر حیران ہیں۔

بادشاہوں یا امیروں کی داد و دہش کی تعریف تو کرنے والوں نے ضرور کی ہے مگر مومن اپنی جدت کے سبب کسی کی تقلید کیوں کریں۔ وہ کہتے ہیں کہ ممدوح اگر سائل کی مٹھیوں کو لعل اور موتی سے بھر دے اور انعام لینے والے کی مٹھی میں اسکی سمائی نہ ہو سکے یہاں تک کہ کچھ گر بھی پڑے یا وہ گرا دے اور انکو چنکر خاکروب لے جائے اور اپنے جھونپڑے میں رکھ دے تو اسکا تنگ سا مکان بطور خود دوکان جوہری ہو جائے۔ اب قیاس کرو کہ گرے پڑے مال سے جب وہ اتنا مالدار ہو جائے تو وہ شخص جسکو یہ انعام ہو کسقدر متمول بن سکتا ہے

عنوان تاریخ گوئی

جان کیا کے آزاد نے ایک تذکرہ لکھا تو یہ بھی سمجھ لیا کہ ہم خود خاقانی ہند ہو گئے خدا کی شان یہاں لوگوں نے عمر گذار دی اور یہی کہتے رہے ہے

ابھی سے کیا کریں دعوائے شاعری تسلیم　　یہ کام وہ ہے کہ جو عمر بھر نہیں آتا

اب آزاد صاحب کی سخندانی ملاحظہ ہو کہ تعمیہ اور تخرجہ تاخین غیب میں داخل ہیں یعنی صنائع و بدائع ہیں و انکا شمار نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مومن کو بہارت گذر گئی آخر ہی دور کے شعرا میں امیر تک سے کہ ایک ماہر فن اوستاد تھے اسکو اختیار کیا ہے وہ داغ کے دیوان پر لکھتے ہیں کہ ع شاعر نکالیں حوصلے مہتاب داغ سے یعنی مہتاب داغ سے اگر حوصلہ کے اعداد نکال لو تو تاریخ طبع نکل آتی ہے۔

بہر حال میں عرض کر آیا ہوں کے مومن ہمیشہ راہِ عام سے الگ رہے اسلئے ہی بالقصد اُنہوں نے ان کوچوں میں قدم رکھا جہاں ہر شخص کا گذر نہیں اس مشکل فن میں وہ وہ کمالات دکھائے کہ ذوق کیا غالب تک کی وہاں رسائی نہیں ہے

مومن نے اپنے والد کی تاریخ انتقال لکھی ہے ؎

بہ ملن الہام گشت سالِ وفات	کہ غلامِ نبی بحق پیوست

یہ تعمیہ ہے یعنی غلام نبی میں حق کے اعداد کو ملا دو تو سال نکل آئیگا۔

اپنی لڑکی کی تاریخ لکھی ہے ؎

نال کٹنے کے ساتھ مومن نے	کہی تاریخ دخترِ مومن

یعنی دخترِ مومن سے نال کے اعداد نکال لو تو تاریخ ولادت نکل آتی ہے

اسی طرح ایک کنوئیں کی تاریخ لکھی ہے۔ ع آبِ لذت فزا بہ جام بگیر

آبِ لذت فزا کو جام میں ڈال دو تو ۱۲۶۵ھ نکل آئیگا تعجب ہیں اک ورنہ یکمال انہوں نے

اپنے اُستاد علامہ شاہ عبدالعزیز کے وصال کی تاریخ میں دکھایا ہے یعنی ؎

دستِ بیدادِ اجل سے بے سروپا ہوگئے	فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

۱۲۳۹ھ

اسمیں یہ صنعتِ عجیب ہے کہ مصرعِ ثانی میں جتنے الفاظ ہیں اُنکے اول و آخر کے حرفوں کو گراتے ہوئے چلے جاؤ۔ بیچ کے حرفوں سے سال نکل آئیگا جیسے فقر لفظ ہے اسکے ف۔ اور ر کو گرادو صرف ق کو رہنے دو قس علیٰ ہذا غالباً دنیا کے پردے میں اسکی نظیر دشوار ہے اور اگر مومن کے بعد کسی نے ایسی تاریخ لکھی تو تتبع ہے۔

آزاد جو یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ سادی تاریخوں پر قادر نہ تھے یہ بھی آشفتہ بیانی ہے رمل اور نجوم کا جاننے والا علمِ حساب میں کمزور نہیں ہو سکتا خیر سادی تاریخوں کو دیکھو۔

خلیل خاں کی ختنہ کی تاریخ لکھی ہے سنت خلیل اللہ۔
اپنے عمہ مرحومہ کی تاریخ فرمائی ہے ۔ لہا اجراً عظیم ۔
اپنے والد کی اک اور تاریخ لکھی ہے ۔ فاز نازفوزاً عظیماً۔
کالے صاحب کے مرنے کی تاریخ لکھی ہے ع کالے صاحب کو سرخرو پایا ۔
مولانا محمد عمر صاحب کے مرنے کی تاریخ ہے ۔

مجھے سالِ تاریخ کا تھا خیال کہ سب نے کہا مرگ شیخ زماں

معمہ اور پہیلی ۔
اس میں حضرت امیر خسرو کے ہم عنان ہیں۔ غرض کسی فن میں بند نہ تھے۔

معمہ مہتاب رائے

بنے کیونکر کہ ہی سب کار الٹا ہم الٹے بات الٹی یار الٹا

ہم۔ بات ۔ یار ان تینوں الفاظ کو الٹ دو تو مہتاب رائے کا نام بطنِ مصرع سے پیدا ہو جاتا ہے ۔

گھنٹے کی پہیلی

نہ بولے وہ جب تک نہ کوئی بلائے نہ لفظ اور معنے سمجھ میں کچھ آئے
نہیں چور۔ پروہ لٹکتا رہے ٹنگ ٹنگ زمانہ کا احوال بکتا رہے ٹنگ
شب وروز غوغا مچایا کرے اسی طرح سے مار کھایا کرے

تخمیس

یہ بھی خاص انکے حصہ کی چیز ہے دوسرے کے شعر کو اپنا کرلینا یہ اسکی صفت ہے قدسی کے شعر پر انکے مصرعے ہیں ۔

ہوئی انجیل کہاں ناسخ و توریت و زبور تیری خاطر سے خدا نے یہ نکالا دستور
ہے رعایت تیری ہر بات کی کتنی منظور ذات پاک تو دریں ملک عرب کردہ ظہور

زاں سبب آمدہ قرآں بہ زبان عربی

قطعہ۔

اس میں چسپیدگی۔ روزمرہ۔ اور زبان کی بہار دیکھیے۔

زانوئے بُت پہ جان دی۔ دیکھا؟ مومن انجام و اختتام مرا

بندگی کام آ ہی آخر کو میں نہ کہتا تھا کیوں؟ سلام مرا

مثنوی۔

اسکا انداز مومن کے تعشق کی بحث میں دکھا چکا ہوں۔ دوبارہ ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ ہاں بعض معترضین کا جواب دینا جنھوں نے چھوٹا منہ اور بڑی بات کہی ہو ضرور ہے۔ یعنی وہ لکھتے ہیں کہ یہ مثنویاں عُریانی احوال سے بھری ہوتی ہیں۔ اور انکا اثر اخلاق پر اچھا نہیں پڑ سکتا۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ مثنوی خواب خیال مصنفہ میر اثر برادر خواجہ میر درد یا ان مثنویوں سے بھی زیادہ خراب ہیں جن کے اشعار میں یہ مصرع بھی داخل ہے کہ ع ساری کھٹیا لہولہان ہوئی۔

(فیصلہ) مثنوی عیق مصنف نے احوال خاص میں لکھی ہے۔ دوسری مثنویاں جنہیں اپنے کو مخاطب تو کیا ہے مگر واقعی زمانہ کے شوقینوں اور نوجوانو کے حالات سے وابستہ ہیں کیونکہ مومن کو کسی مورخ نے آوارہ روزگار نہیں لکھا اور اسی صورت میں تم سمجھو کہ نہ سمجھو مگر وہ عشق کا ڈرامہ جو خیالی ہے نتیجہ سے خالی نہیں نیز اُن کے دامن اتقا پر تمہارے لگائے داغ نہیں لگ سکتا۔ مومن کی ان مثنویوں تک جذبات عشق مجازی کو مدنظر رکھکے میر حسن کی مثنوی جسمیں خلاف یقین دیو اور پری کے قصے ہیں۔ ہرگز نہیں پہونچ سکی۔

ہاں انداز بیاں اسکا نہایت مرغوب ہے۔ اور ترکیب کی الجھنوں سے پاک مگر یہ دور انگریزی نہیں ہے

یہ ایک اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ مومن نے عشقیہ مثنویوں میں پھر اپنے کو مخاطب کیوں

کیا اسکا جواب میرے پاس اسی قدر ہے یعنی ؎

حق تو یوں ہے کہ عجب لوگ ہیں مردانِ خدا — اپنے سر غیر کی ناحق یہ بلا لیتے ہیں

مومن کی بعض مثنوی مذہبی جوش بھری ہوئی ہے جسکو نام کے مسلمان پسند نہیں کر سکتے ہیں بلکہ وہ جو ہر وقت راہ حق میں اپنا سر لئے کھڑے ہیں پسند کرینگے۔ دیکھو کس جوش میں لکھتے ہیں اور جہاد و شہادت کے کیسے تمنائی ہیں ؎

کوئی جرعہ دے دین فزا جام کا — کہ آجائے بس نشہ اسلام کا

برنگِ مئے ایمان کو آجائے جوش — نہ اپنا رہے اور نہ دنیا کا ہوش

یہی اب تو کچھ آگیا ہے خیال — کہ گردن کشوں کو کرو پائمال

یہی جذبات حضرت سید احمد صاحب بریلوی میں بھی تھے۔

رباعیات۔

اسکے اندر تشریح طلب کوئی بات نظر نہیں آتی اسلئے بطور یادگار کچھ رباعیاں لکھے دیتا ہوں۔ یہ اُسی انداز کی ہیں جب کہ انکے عہد کے اساتذہ نے لکھیں ہاں رنگ یہ اپنا ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

جورِ معشوق

شوخی تھی زبس میرے ستانے کیلئے — گرمی تھی یہ آگ پر لٹانے کیلئے

دشمن پہ نگاہ سرد مہری کے سبب — تم آگ ہوئے میرے جلانے کیلئے

عقیدتِ شاہِ شہدا

روشن ہے جو ہے آلِ عبا کا پایہ — ہاں مرتبہ تسلیم و رضا کا پایہ

قندیل ہے عرش کی جو ہر جانِ شہید — کیا ہوئیگا شاہِ شہدا کا پایہ

مرثیہ زندگانی

ہے عہدِ شباب زندگانی کا مزا پیری میں کہاں وہ نوجوانی کا مزا
اب یہ بھی کوئی دن میں فسانہ ہوگا باتوں میں جو باقی ہے کہانی کا مزا

اسمیں شک نہیں کہ میر انیس مرحوم نے پیری کی رباعیاں خوب خوب لکھیں اور انکے خاندان والوں کی ذات پہ یہ چیز ختم ہوگئی مگر اوپر کی رباعی اسوقت کی ہے جب مومن کے پاس اس بام تک پہونچنے کو کوئی زینہ نہ تھا۔

واسوخت۔

یہ بھی انکے عہد کی کوئی نئی چیز نہ تھی۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ اونھوں نے اس چیز کو بازاری رنگ میں رنگا اور انھوں نے اسکو خونِ جگر میں ڈبویا ہے۔ یعنی وہی لکھا جو اپنے پر گذری۔

دیکھو اس بند میں کیا کیا طعنے یہ معشوق کو دے رہے ہیں اور وہ ہمہ تن گوش سر جھکائے ہوئے شرم سے عرق عرق ہے۔

میں ہی تو رہا ہوں کہیں شب کو خوش و خرم میں نے ہی تو کی بادہ کشی غیر سے باہم
میری ہی نظر سے ہے عیاں نیند کا عالم آتی ہی جمائی پہ جمائی مجھے ہر دم
انگڑائیاں لیتا ہوں یہ بے میں ہی تو پیہم میری ہی تو گردن میں پڑا جاتا ہے یہ خم
میری ہی تو آنکھوں میں غضب نیند بھری ہے
میری ہی جبیں ہے کہ جو گھٹنے سے لگی ہے

اس تصویر کے دیکھنے کے بعد یہ ماننا پڑیگا کہ گو معاملہ کی صورت تو ایک ہے مگر یہ نیچرل انداز انکے عہد و قبیل کے اساتذہ نہ دکھا سکے۔

کلامِ فارسی۔

میں پہلے عرض کرچکا ہوں غدر کے بعد فارسی ہندوستان کے پردے سے گویا اٹھ گئی ہی نہیں بلکہ جو غور کرو تو قبل غدر بھی توجہ اسپر نہ تھی خاص طور پر مومن کے

آدمی تھے جو اپنی بزم میں بیٹھ کے روز گا لیتے تھے۔ غالب جنکا دعوی ہے کہ اصل مذاق میرا فارسی ہے اُنکی صحبتوں کا بھی یہی حال تھا کہ مہینے میں ایک آدہ بار فارسی کے مذاق والے جمع ہو کے فارسی غزلیں پڑھ لیتے تھے۔ آج تو اسکا ذکر ہی بیکار ہے۔ مگر جب تک قیامت نہیں آتی ہے اُس وقت تک جو شے عالم ایجاد میں آچکی ہے مٹ مٹا کے بھی ضرور رہیگی اسلئے جو چند بوڑھے اس مذاق کے باقی ہیں اُنکو کیوں محروم کہوں مومن کا فارسی کلام بصورت دیوان موجود ہے اُسکو پڑھ کے اہل ذوق جھگڑ لیں اور نقادان فن لڑلیں کہ اُن کا کیا پایہ تھا میں اسیقدر کہے جاتا ہوں کہ زور کلام اور جوش بیان جو مومن کا اُردو میں ہے وہی فارسی میں ہے۔ زبان میں اُنکی قدرت اور خیال میں ندرت ہے۔ لو چند اشعار سن لو۔

تو بر جنازہ مومن اگر نماز کنی — نتاب رشک ملایک بدوزخ اندازند

میں آگے عرض کر چکا ہوں کہ مومن کا رنگ فارسی میں بھی اپنے حال پر قائم ہے۔ دیکھیے اس شعر میں بھی محبتہاے پنہاں اور رشکہاے پیدا موجود ہے۔

چناں بنالہ ام گوشے نہد بیدرد میلا — محبتہاے پنہاں را شکایتہاے پیدا را

خوش نیست دور چرخ و مہ آفتاب را — از سر نہاد جہان خراب را کہ

امشب عسس ز کوی تو ام چون برد کوش — فریاد من ز دیدہ شد و بُرد خواب را

جائے رحم است بر آن بسمل مسکیں کہ ہنوز — نیم جانے بہ تنش باشد و قاتل برود

وہ بسمل بیکس واجب الرحم ہے جسکی جان ابتک ہنوز نہیں نکلی اور قاتل انتظار خون کیے بے اسکی لاش کو کسی جگہ چھپانے یا دفن کردینے کو مقتل سے لئے چلا جاتا ہے اتنا بھی انتظار نہیں کہ جان تو نکل لے۔ یہاں قاتل کی بے دردی اور بسمل کی بیکسی قابل لحاظ ہے۔

ہم تاب وصل نیست من بے نصیب را — خود دشمن خودم نشناسم رقیب را

گر بہ چنین کسے سروکار ہے فتنہ تیرا — ناصح بمرگ من کہ چہ تدبیر می کنی
مومن چہ کافری کہ بایں طالع زبوں — کار مرا حوالہ بہ تقدیر می کنی
برو برو طرف کوئے مدعی کیں را — ہزار بار غلط کردہ و باز کنی
زبان بہ طعنۂ دشمن کشادہ ام۔ دائم — بایں دہن نتوانی کہ شرح راز کنی۔

قصیدہ فارسی جو زمین عرفی میں ہے۔ نیز تواریخ و رباعیات فارسی وغیرہ کو اسلیئے قلم انداز کرتا ہوں کہ ذوق معدوم ہے۔ ع ہر سخن موقع و ہر نقطہ مقامی دارد

مرثیۂ معشوق۔

صنف شاعری میں یہ ایک نئی چیز ہے جو مومن عالم وجود میں لائے۔ ورنہ معشوق کا مرنا گو نیچر کے مطابق ہے مگر کون مانتا ہے۔ رشک مرحوم نے ایک شعر لکھا تھا جس پر لکھنؤ والے منہ آتے تھے اور کہتے تھے کہ معشوق کا برا چاہنا رشک کا کام ہے ؎

بھیک مانگے گا ہر ایک دریا ہو گو تم اگر — کشتی ملاح کجکول گدا ہو جائیگی

بہر حال جب موت ہر شخص کیلیئے لازمی ہے تو کیا معنی کہ ہم مر جائیں اور ہمارا بوڑھا معشوق قیامت تک چشم نابینا سے آنسو بہایا کرے۔

خیر ان مرثیوں کی صورت میرے ایمان میں وہی ہے جسکو میں آگے لکھ آیا ہوں۔ جذبات عشق اور درد انگیزی ان شعروں کی ملاحظہ ہو جو خود واقعہ جانکاہ کا پتہ دیتی ہے ؎

انکو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گذری
دوست جو ساتھ مرے تا لب ساحل آئے

دل کسطرح سے نہ کھینچے چلی جان کو کیا ہوا — دم میں نہیں ہے دم مری جانان کو کیا ہوا

(دلبستی کنگھی جسکو عام طور پر عورتیں ہی استعمال کرتی ہیں اسکا نقشہ ملاحظہ ہو)

سر پٹیتا ہے شانہ پڑا دونوں ہاتھ سے ‏ ‏ کیا جانے اسکی زلف پریشاں کو کیا ہوا
پیتی ہے اپنا خونِ دل افسوس سے حنا ‏ ‏ اُس دستِ رشکِ پنجۂ مژگاں کو کیا ہوا

(ذیل کے شعر میں شرمندہ سازِ مہرِ درخشاں کی اچھوتی ترکیب ملاحظہ ہو)

شبنم کو پھر ہے جانبِ خورشید التفات ‏ ‏ شرمندہ سازِ مہرِ درخشاں کو کیا ہوا
دلمیں شکن ہے زلفِ مسلسل کدھر گئی ‏ ‏ برہم ہے حال کاکلِ پیچاں کو کیا ہوا
بوئے قبائے یوسفِ گل ہے نسیم میں ‏ ‏ اُسکی شمیمِ عطرِ گریباں کو کیا ہوا

(لذت فزا اور زخم بے مزا کی جدتوں کو دیکھیئے)

لذت فزا الم نہیں اُس لب پہ کیا بنی ‏ ‏ کچھ زخم بے مزہ ہیں نمکداں کو کیا ہوا
گردش پہ اپنی ناز ہے پھر روزگار کو ‏ ‏ اُس چشمِ رشکِ فتنۂ دوراں کو کیا ہوا
دعویٰ ہے شوخیوں کا غزالانِ دشت کو ‏ ‏ اُس خوش نظر کی جنبشِ مژگاں کو کیا ہوا

عیب و حجابِ شمع رخاں جہاں گیا
وہ مہرِ آسمانِ نکوئی کہاں گیا

کھو دی خزاں نے رونقِ گلزار ہائے ہائے ‏ ‏ پژمردہ ہو گئے گلِ رخسار ہائے ہائے
پھرتی نہ تھی جو پردہ نشیں گھر میں بے حجاب ‏ ‏ نعش اُسکی جائے ہے سرِ بازار ہائے ہائے
سروِ فتادہ قامتِ محشر خرام ہے ‏ ‏ کیا ہو گئی وہ شوخیٔ رفتار ہائے ہائے
اے چرخ پا کش تجھے پاسِ وفا نہیں ‏ ‏ میں اور رنج و حسرت و آزار ہائے ہائے

نظارہ ہے محرکِ ماتم ہزار حیف
ابرو ہوا ہلالِ محرم ہزار حیف

اندازِ تغزل ـ

بہارِ بےخزاں ایسی نہیں کوئی چمن کرتا ‏ ‏ خدا جو فکرِ رنگیں دے تجھے یہ گلزار پیدا کر
تغزل کا انکے اندازیہ کہ اشعار انکے مضامین پیچیدہ سے نازک خیالوں اور نادرے

ترکیبوں کے ساتھ درد وغم سے معمور ہیں ایک ہی لفظ کو متواتر لاتے ہیں اور معنے عجیب و دلکش پیدا کر دیتے ہیں بہترے شعر ایسے بھی ہیں جو بالکل سہل ممتنع ہیں اور عام دماغوں کی وہاں تک رسائی نہیں یہی سبب ہوا کہ کلام انکا خاص پسند رہا اور ہے۔ مگر مجھے اپنی تشریحات سے یقین ہے کہ اگر اسی طرح اور اہل قلم بھی متوجہ ہوئے تو مقبولیت عام رکھی ہوئی ہے۔ ابتداً غالب کی شاعری کا بھی یہی حال تھا۔ خیر ؎

نالۂ بلبل شیدا تو سنا ہنس ہنس کر اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

لو میں چند شعروں کو بطور نمونہ پیش کر دیتا ہوں۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یہ وہی شعر ہے جس پر غالب سینے پہ ہاتھ رکھ کے شب بھر ٹہلتے رہ گئے اور یہی کہا کہ اے کاش خانصاحب اپنا یہ شعر دے دیں اور مجھ سے دیوان لے لیں۔ اس شعر کو تصور کی معراج حاصل ہے ہر چند غالب نے بھی لکھا ہے کہ ؎

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

یعنے مجھ سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کرے اپنے رنگ اور اپنی محویت میں رہنے دو۔ مومن کہتے ہیں کہ بھئی مجھے تو عرصہ ہوا وہ منزل حاصل ہو چکی تھی اب تو تصور کے اُس مقام پر ہوں کہ جب میرے پاس کوئی دوسرا نہیں رہتا ہے تو تمہیں تم ہوتے ہو اور اسطرح ہوتے ہو کہ جیسے کوئی ہمکلام ہو۔ اے سبحان اللہ سبحان اللہ گویا کے لفظ نے اس شعر کو آسمان ہفتم پر پہونچا دیا ہے۔ اور تصور کو آجتک کسی شاعر نے ایسا بیان نہیں کیا۔ اسلئے خالی یہی ایک شعر مومن کے مقدر کا فیصلہ کرنے کو بس ہے

"لو" اے بتو سنو کہ وہ مومن خدا پرست مسجد میں آج جا کے مسلمان ہو گیا

کیا اُلٹی بات ہے کہ مومن جب خدا پرست تھا ہی تو کافروں کیطرح خصوصیت کے

ساتھ مسجد میں جا کے مسلمان پھر کا ہے کو ہوا۔ صرف مومن ہی دلیل اسکے مسلمان ہونے کی تھی۔ پھر یہ کہ خدا پرست ہی تھا۔ مزا یہ بھی ہے کہ کوئی قاموسی لفظ نہیں جس کے معنے بتاؤں۔

اب مجھسے سنو۔ الصلوٰۃ نور۔ یعنی نماز کی وہ روشنی ہے کہ شرق سے غرب تک عالم کو منور کر دیتی ہے اور درمیان میں کوئی پردہ از حجاب عظمت تا بہ تحت الثراہی باقی نہیں رکھتی۔ (مگر یہ صلوٰۃ معراج المومنین ہے نہ کہ ہمارے ایسے پراگندہ روزگار کی نماز کہ مسجد میں بھی بیٹھے بیٹھے کیسکے کوٹھے کا طواف کر آتے ہیں) یہاں مومن بتوں کو متوجہ کر کے کہتے ہیں کہ اب وہ تمہارے دام میں کیا پہنچیگا جب تک وہ کوچہ عشق مجاز میں تھا اُسکا ایمان بالغیب تھا اور خدا پرستی ہی یقین کے درجہ میں پہونچکر نہیں کرتا تھا۔ لو آج اُس نے جا کی مسجد میں نماز پڑھ لی ایمان اُسکا عین الیقین کے درجہ پر اسوجہ سے پہونچ گیا کہ بے حجاب اُس نے جلوہ حقیقت کا مشاہدہ کر لیا۔ اور آج مسلمان اور حق شناس ہو گیا۔

ایسا شعر وہی کہہ سکتا ہے جو عالم باخبر اور صاحب طریقت ہو۔ جب تک مسجد میں مومن نہ جاتے (اور مسجد میں آدمی اسی لئے جاتا ہے کہ نماز پڑھے) اور نماز نہ پڑھتے ایمان بالغیب ہی رہتا۔ اور مجاز ہی سے حقیقی میں کسطرح آدمی پہونچتا ہے وہ یہ نہ سمجھتے۔

قطع اُمید سے سر کٹنے کو کیا نسبت | مجھ میں ہر دم ابھی تیرے خنجر میں نہیں

مومن جذبات ذوق کے جوش میں یہ کہتے ہیں کہ اگر وصل کے طرف سے قطع اُمید ہو گئی تو اسکے یہ معنے ہیں کہ ہمت ہار کے خودکشی کر لوں۔ اپنا سر آپ کاٹ ڈالوں لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ میں ہمت مردانہ رکھتا ہوں۔ اس مٹی ہوئی حالت پر بھی مجھ میں

وہ دم ہے جو ابھی تیرے خنجر میں نہیں ہے۔ وہ اور ہیں جو مایوسیوں سے تنگ آکے خودکشی کر لیتے ہیں یہاں تو سر ہے اور تیغِ رضا ؂

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

نہ مانو نگا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا
کہ ہر ہر بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا

یہ میرا وعدہ ہے یہ میرے اختیار کی بات ہے میں ناصح کی نصیحت کو نہ مانونگا۔ مگر یہ جو آپ شکایت فرماتے ہیں کہ تو اُسکی نصیحت سننے کیوں گیا۔ تو بے ادبی معاف مجھے تو یہ عرض کرنا ہے کہ میں اُسکی باتیں سننے پر معذور و مجبور تھا کیونکہ وہ ان تذکرہ میں وہ بار بار جناب کا نام لیتا تھا پھر کیسے ممکن تھا کہ جہاں آپکا نام آئے وہاں میں نہ ہوں اور اُسکو میں نہ سنوں۔ خانصاحب کی ان پیچدار باتوں میں بڑا مزا آتا ہے اور سچ ہے کہ آدمی شعر کہنے کو کہہ سکتا ہے مگر یہ نہیں لکھ سکتا ہے۔ اس فن میں عمر گذار دی مگر یہ نہ آیا اور اب کیا آئے گا ؂

رُک رُک کے دم پھر ہی دم آنے کو کیا کہیے
جینے کا یہ عالم ہے مر جانے کو کیا کہیے

ان نصیبوں پر کیا اخترشناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

یعنی تقدیر تو ایسی پائی کہ تو بہی بھلی۔ اب اُس پر اخترشناسی اور علم نجوم ٹھہرے ہے یعنی جو جھوٹی اُمید وصل پر بھی جو زندہ رہتا تو نہیں رہ سکتا اسلئے کہ جب اپنی کم سیاہی کو دیکھتا ہوں تو دل پکار اُٹھتا ہے کہ ؂

ایک نجومی داغ سے کہتا تھا آج
آپکے دن اب جناب اچھے نہیں

اب تو مر جانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو
ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اُٹھا جائے ہے

غدر سے پہلے کی زبان ہے مگر اسکی مٹھاس میں آجتک شہد و مصری کا مزا ملتا ہے اب شعر کی نزاکت سنو وہ فرماتے ہیں کہ مرنے کے لئے دنیا سے اُٹھنا شرط ہے مگر یہاں تو ضعف سے اُٹھنے کے قابل ہی نہیں رہا ہے پھر مروں کسطرح۔ اب ایک قیامت

ہنر قیامت کبرای بھی آئے تو میں ہوں اور میری زندگی۔

کیا کیجئے کہ طاقت نظارہ ہی نہیں ۔۔۔ جتنے وہ بے حجاب ہیں ہم شرمسار ہیں

لیجئے ضعف نے طاقت نظارہ زائل کر دی۔ اور انہوں نے جب یہ دیکھا کہ عاشق کی آنکھ دیکھنے کی ہیں تو بے حجاب ہو گیا۔ اب جتنا وہ بے حجاب ہے ہم اُسی قدر اپنے ذوقِ دید سے شرمندہ ہیں۔ یا یوں کہو کہ تجلّے رخ یار سے آنکھوں میں خیرگی ہے۔ آفتاب پر نگاہ جمے تو کیسے اب جو کثرت نور سے آنکھیں بند ہو جاتی ہیں تو اُسکو اپنے حُسن کی گرمیوں کے دکھانے کا اور بھی موقع ملتا ہے اور میں جب کوشش پیہم پر بھی ناکامیاب رہتا ہوں۔ تو ندامت سے عرق عرق ہو جاتا ہوں مومن اسکے سامنے آکے جلوہ نما ہونے کو لکھتے ہیں غالب یہ کہتے ہیں گھٹی کی آڑ میں اُنکا فضول ہے

جب وہ جمالِ دلفروز صورت مہر نیمروز ۔۔۔ آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

غرض مومن ہوں کہ غالب دونوں بیک وقت دو راستوں سے چلتے ہیں مگر جب منزل پر پہونچتے ہیں تو ایک ہی درخت کے سایہ میں بیٹھ کے یہ باتیں کرتے ہیں کہ میر و سودا کے بعد ہمیں دو شخص دھلی کے نام کی بقا کو کافی ہیں۔

کس پہ مرتے ہو آپ پوچھتے ہیں ۔۔۔ مجکو فکرِ جواب نے مارا

کیوں صاحب یہ آپ پوچھتے ہیں جو مجھے جانتا ہو بتلائیے تو سہی کہ اس سوال کا جواب کیا دوں۔ اگر یہ کہوں کہ آپ پر مرتا ہوں تو کیا آپ اسکو مانینگے ہرگز نہ مانینگے مضحکہ میں جی ہاں کہکے اُڑا دینگے۔ لیجئے میرے پرانے دوست غالب آگئے بھئی تم بڑے فلسفی مشہور ہو۔ رند ہو۔ یہ ہو۔ وہ ہو۔ غرض سب کچھ ہو بتاؤ تو سہی اس سوال کا کیا جواب ہے۔ اور کیا جواب دوں۔ لو صاحب یہ تو کہتے ہیں میں تمہارے پاس خود اسی لیئے آیا ہوں۔ کہ اپنے مرض کا علاج کراؤں اور نسخہ پوچھوں خدا بخشے مولوی فضلِ حق کی رنڈی جسنے عرصہ تک ہماری آن بان دیکھی۔ ہمارے

جوانی دیکھی۔ میرا نکھرا ہوا چہیتی سنگ دیکھا۔ اب جو ادہر نزلہ سے دو چار بال پک گئے اور میں نے سر ہی منڈوا ڈالا۔ تو آج انجان بنکے سے

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے — کوئی بتلا دو کہ ہم بتلائیں کیا

(غالب کا اگر زور چلتا تو وہ بعوض پوچھتے ہیں کے پوچھتی ہے لکھتے)

خیر اب تو غالباً میرے بیان کی تصدیق ہو گئی ہو گی کہ مومن کے مقابلہ میں اگر کوئی لایا جا سکتا ہے۔

تو غالب۔

جب ہو گیا یقین کہ نہیں طاقتِ وصال — دم میں ہمارے وہ ستم ایجاد آ گیا

یعنی جب معشوقہ کو یقین ہو گیا کہ مومن میں طاقتِ دید نہ رہی۔ تو مغالطہ میں آ کے اسکے گھر چلا آیا اور جب چلا آیا تو طاقتِ وصال پر بر ملا و بے حجابانہ کہتا ہے کہ

زور و زر جبکہ کچھ نہ تھا لے میر — کس توقع پہ آشنائی کی

اب ہمت مردانہ سے کام لیکے مومن ڈٹ جاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ دم میں آ گئے۔ واہ کہیں غالب صاحب بھی اسی کمرے کے ایک کونہ سے لگے کھڑے تھے فرمانے لگے کہ بھئی کیا کہوں سے

کہتے ہیں جب مجھے نہ رہی طاقتِ سخن — جانوں کسی کا حال میں کیونکر کہے بغیر

جب یہ سنا تو مومن کے معشوق نے جھلا کے کہا کہ ہٹ یہ سب تیرے بوڑھے چوچلے ہیں اب میں کبھی تم دونوں کی بات پر یقین نہ کروں گا دونوں جھوٹے ہو۔ تنقید اور تشریح کی بہار دکھاتے ہوئے اب میں ناظرین کو اُس صحرا میں لاتا ہوں جہاں دو عظیم الشان پہاڑ آپس میں ٹکرا رہے ہیں سے مومن

وقتِ جوشِ جگر گریہ میں جو محوِ نالہ تھا — حلقہِ گرداب ہر اک شعلہِ جوالہ تھا

غالب فرماتے ہیں کہ سے

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرہ ابرِ آب تھا   شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

بتلایئے ہمرنگی اور ہم آہنگی کی کوئی حد بھی۔ وہی انداز پھر دیکھئے۔

مومن سے

رشکِ پیغام ہے عنان کشِ دل   نامہ بر راہ بر نہ ہو جائے

غالب سے

ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ   یا رب اپنے خط کو ہم پہونچا آئیں کیا

مختصر یہ ہے کہ اگر فلسفۂ غالب بھی ہم رکابِ مومن ہوتا یا نازک خیالی مومن شریکِ غالب ہوتی تو دونوں اساتذہ کے کلام کا فرق نکالنا مشکل تھا۔ بحال سے

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جوان ہے   دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زبان ہے

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا   میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

وہ کہتے ہیں کہ میں نے بہت امتحان تیرے جذبِ دل کا کیا اُس میں کوئی اثر نہ پایا اگر اثر ہوتا تو میں تیرے پاس پہونچ گیا ہوتا۔ اب جو تو میرے پاس انتظار کر کے چلا آیا ہے تو یہ میرے جذبِ دل کا سبب ہے جس نے تجھے کھینچ لیا۔ اب اسی حالت میں مجھ پر تیرا الزام ہی غلط بلکہ تیرا ذاتی قصور ہے (اس گفتگو کے بعد بیچارا حسکے کہ عاشق منفعل ہو کے خاموش ہو جائے اور کیا کر سکتا ہے۔)

ہوں کیوں نہ مجھ حیرتِ نیرنگیٔ عشق   جو دل میں شعلہ تھا وہی آنکھوں میں آب ہے تیرا

عشق کی نیرنگیوں کا ہے حیران ہوں کہ اگر دل میں محبت کی آگ نہ بھڑکی تو آنسو آنکھوں سے نہ نکلتے یہ وہی آگ ہے یہ وہی شعلہ ہے جسکو تم آنسو کے شکل میں پا رہے ہو کیا کیا منطق اور حکمت کے مسئلوں کو حل کیا ہے۔ سبحان اللہ۔

دشنام یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں   لے ہم نفس نزاکتِ آوازِ دیکھنا

آواز کا وزن بظاہر کچھ نہیں معلوم ہوتا مگر جو سے نہیں تو پھر شیشۂ دل چور کلی

پتھر کا کام کیوں کرتی ہے۔ وہ معشوق کی نزاکت کے ساتھ اپنی نازکخیالیوں سے معشوق کے آواز کی نزاکت کو یوں سمجھاتے ہیں کہ اُسکا کوئی بار میرے قلبِ ضعیف پر نہیں معلوم ہوتا ہے۔ اور نکتہ یہ ہے کہ واقعی عاشق کو معشوق کی گالی کچھ گراں نہیں ہوتی اسی کی دوسری صورت داغ نے دکھائی ہے کہ ع معشوق کی گالی سے کچھ عزت نہیں جاتی۔ مگر استغفر اللہ زمین آسمان کا فرق ہے۔

بجلی گری فغاں سے مری آسماں پر جو حادثہ کبھی نہوا تھا سو اب ہوا

دنیا سے بالکل الگ لکھا ہے۔ بجلی آسمان سے زمین پر گرتی ہے نہ کہ آسمان ہی پہ چمکے اور اُسی پر گرے۔ اب ایک نازک اسرار قابلِ لحاظ ہے یعنی وہ بجلی نہیں ہے بلکہ فغاں کی بجلی ہے۔ اور خاصیت بجلی کی یہ ہے کہ جس پر گرے اُسکا خاتمہ کر دے مومن یہ کہتے ہیں کہ میری فغاں اسقدر بلند ہے کہ وہ آسمان کے اوپر تک گئی اور چونکہ اوپر کے طرف جاتی ہے پلٹنا اُسکو لازم ہوا اسلئے وہ جو پلٹی تو آسمان کا خاتمہ کرتی ہوئی پلٹی۔ اور یہ وہ حادثہ ہوا جسکو کبھی اہلِ زمین نے دیکھا ہوگا۔

آغشتہ ہم خوں دستِ نگاریں کو پوچھتے ہیں وہ اُلٹے کف جلاد میں دامن ہو ہمارا

یہ بھی بالکل اچھوتا بیان ہے۔ مقتول کے ہاتھ میں از روئے قاعدہ جلاد کا دامن ہونا چاہیئے یہاں جلاد کے ہاتھ میں مقتول کا دامن ہے۔ وہ کسطرح کہ خون آلود ہاتھ کو جلاد مقتول کے دامن خونِ ناحق چھپانے کو پونچھ رہا ہے۔ مگر دنیا تو اس نکتہ کو نہیں سمجھ سکی اُسکا تو یہی خیال ہے کہ مقتول ہی خطاوار ہے جبھی تو جلاد نے اُسکا دامن پکڑ رکھا ہے۔

ہٹ گیا ہوگا دوپٹہ سوتے میں کہیں شب یہاں رہنے کا تیرے سب میں چرچا ہو گیا

ہاں جناب حکیم صاحب یہ ضرور ہوا ورنہ وہ اگر دوپٹہ اُوڑھے ہوئے پڑے رہتے تو کون جانتا کہ صاحب جی ہیں۔ آپ نے ہی اسکا خیال نہیں کیا۔ یہاں تک

آپ کے احباب کمرے میں آگئے اور اسکا چرچا بازار و نہیں ہو گیا۔

شوخ کہتا ہے ،، بے حیا جانا   دیکھو دشمن نے تمکو کیا جانا

رقیب کمبخت بالکل بے شعور ہے۔ مردک سے پوچھو تو سہی کہ تمکو شوخ ہم کہتا ہے یعنی ہمیں دیگر بے حیا بتاتا ہے۔ کیونکہ جب شوخی بات میں غالب ہو جاتی ہے تو درمیان سے حیا اٹھہ جاتی ہے۔ توبہ توبہ اس کمبخت کا ساتھہ چھوڑو۔ (یعنی کسیطرح ایسی نفرت دلاؤ کہ وہ میرے ہتے چڑہ جائیں)

چلمن کے بدلے مجکو زمین پر گرا دیا   اُس شوخ بیحجاب نے پردہ اٹھا دیا

پھر وہی شوخ۔ نظر ہو اب یہ کیا کہ شوخی سے جو بیحجابی غالب آئی تو کمرے کا پردہ اٹھا دیا اور بعوض اسکے کہ چلمن گرا رہنے کا موقع تھا اور ہم سامنے تھے پردہ اُٹھا دیا اس کا اُس نے کچھہ خیال نہ کیا یہاں تک کہ میں نے اُسکو دیکھہ لیا اور بے ہوش ہو کے گر پڑا۔ اب ترکیبوں کی الٹ پلٹ کو دیکھئے کہ ایک شعر کے اندر کتنی رعایتیں ہیں چلمن۔ حجاب۔ پردہ۔ پھر اُٹھانے کے مقابلہ میں گرانا۔ بس یہی وہ ترکیب ہے جو اوس کے اختیار کی نہیں نہ اختیار کر سکتا ہے۔

مٹی نہ دی مزار تلک آکے اُس پہ بھی   کہتے ہیں لوگ خاک میں اسنے ملا دیا

کیا کیا حسن بیان ہے۔ تیرے انداز کے صدقے۔ یعنی اسی بدنامی کے ڈر سے کہ احباب جو شریک جنازہ تھے اُسکو دیکھہ کے آوازہ کستے وہ میرے جنازہ پر نہ آیا یہاں تک کہ مٹی بھی نہ دی۔ اب سنو کہ ہٹہ دھرم اس پر بھی یہی کہتے ہیں کہ اُسی نے مومن کو خاک میں ملا دیا۔ جھوٹوں پر لعنت وہ تو خیریت ہوئی ورنہ اگر آکے مٹی دیتا تو جانیں دنیا کیا کیا کہتی۔ غرض مومن کی طبیعت وہ بحر ناپیدا کنار ہے جسمیں پانی کی دھاروں کے ساتھہ موتی بہتے نظر آتے ہیں جسکا جی چاہے دامن بھر لے مگر جہ ذہن رسا کی کشتی کی وہاں تک رسائی بھی ہو۔ معشوق پر مٹی نہ دینے کا جرم ہی ہے

اور پہر دعوی کرنے والا خود انکے طرف سے عذر معقول بھی پیش کر رہا ہے ؎

عجب اس عاشقی کا اُلٹا پلٹا کارخانہ ہے ۔ ہمین روٹھے ہیں اُنسے اور ہمیں انکو مناتے ہیں

جوش وحشت نے اٹھایا العش کو ۔ اپنے پاؤں سو گئے مدفن میں ہم

ہاں کیوں احسان کسی کا لیتے خدا میرے جوش وحشت کو قایم رکھے جو مر کر بھی باقی تہا اور اُسی کے طفیل ہیں کسی کے مرہون منت نہوتے اپنے پاؤں مدفن تک پہونچ گئے۔

خنجر کو نہ توڑ سخت جانی ۔ پہر کسکو گلے لگائینگے ہم

ارے اُن کا گلے لگانا تو عید تک نہیں معلوم اب اگر اے سخت جانی او نکے خنجر کو بھی تو توڑ ڈالیگی تو ہم گلے کسکو لگائینگے کسے کم وہ نہ سہی انکا خنجر ہی سہی

آب وہوائے ملک محبت راس نہیں ہے ہمکو تو ۔ ہوتے ہیں لاغر اور زیادہ جتنا ہم غم کہاتے ہیں

زبان اور درد انگیزی اسکی میر تقی مرحوم کی روح پاک کو پکار رہی ہے ۔ مضمون مومن خاں کے انداز کا ہے آدمی کہانے پینے سے موٹا ہوتا ہے یہ اس غذا کو کہاتے ہیں جس سے روز روز دبلے ہوتے جاتے ہیں ۔ اسی ترکیب میں یہ مضمون دیگر درد کا مطلع یاد آگیا ہے سُن لو ؎

عمر کیا روز روز گہٹتی ہے ۔ جتنا بڑہتی ہے اُتنا گہٹتی ہے

لاش پر آنے کی شہرت شب غم دیتے ہیں ۔ لے پری ہم ملک الموت کو دم دیتے ہیں

شب غم موت آنا معلوم ۔ اور جب مرنا مقدر میں نہیں ہے تو ملک الموت صاحب بھی تشریف نہیں لانے کے ۔ اب جن وانس اور فرشتے تک انکے شیدائی اور مشتاق دید ہیں اسلئے یہ ترکیب نکالی ہے کہ میں اس امر کو غلط مشہور کر دوں کہ میرے جنازہ پر اسنے آنے کا وعدہ کیا ہے اس بہیج میں ملک الموت جائینگے کہ میں بھی اُنکے دیدار سے ذرا مشرف ہو جاؤں تو جب ملک الموت آئینگے

تو پھر میری رُوح قبض کرنے پر بھی وہ مجبور ہونگے بغیر اسکے میں مرونگا کیسے اور جب میں مرونگا نہیں تو وہ جنازہ پر آئینگے کیونکر اور جب وہ آئینگے نہیں تو ملک الموت اُنکی زیارت سے مشرف کسطرح ہونگے۔ مختصر یہ ہے کہ منطقی بحثیں ہیں حُجتیں ہیں پھر پیرایۂ بیان اسقدر پسندیدہ ہے کہ آدمی شعر سمجھے کہ نہ سمجھے داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا ہو۔

جانے دے چارہ گر شبِ ہجر انمیں مت بُلا　　وہ کیوں شریک ہوں مرے حالِ تباہ میں

افسُردہ دل افسردہ کُند انجمنے را　　میں تو بلاؤں میں گھرا ہوا دم توڑ ہی رہا ہوں۔ پھر اے چارہ گر انکو بلا کے میرے حالِ تباہ میں کیوں شریک کرتا ہے اسلئے کہ انکو پریشانی اور افسردگی ہوگی اور اس افسردہ دلی سے میری انجمن افسردہ ہوجائیگی پھر آنا نہ آنا برابر۔

تا نہ پڑے خلل کہیں آپکے خوابِ ناز میں　　ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شبِ دراز میں

وہ یہ فرماتے ہیں کہ شبِ ہجر کی طوالت میں کمی ہو کہ نہو ہم یہ نہیں چاہتے اُنکی خوابِ ناز کا سلسلہ صبح ہوجانے کے سبب ٹوٹ جائے وہ سوئیں اور چین سے سوئیں۔ ہیں ہم ایک دردمند دل خدا کے گھر سے لائے ہیں اپنی عافیت کیلئے دوسرے کو تکلیف دینا اپنا مسلک نہیں۔

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا　　جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

مومن کے حُسنِ بیان کے صدقے کس خوبصورتی سے معشوق کو غیر سے الگ رکھنا چاہتے ہیں یعنی وہ کہتے ہیں کہ میرے دشمن سے اگر تمکو دوستی ہو تو اسکے طرف نہ دیکھو کہ تمہاری نگاہ میں جادو بھرا ہوا ہے اُس پر یہ چل گیا تو مرجائیگا اور گرچہ مجکو مسرت ہوگی مگر تمکو تو صدمہ ہوگا۔

کیا حضرتِ مومن کہیں کعبے کو سدھارے　　سُنسان ہے گھر کس لئے کیوں آج ہی در بند

وہ جیسے کعبے کے جانے والے ہیں مجھے معلوم ہے۔ صاحب کوئی بتاں ہیں ڈھونڈو وہیں کہیں ہونگے۔

شب وہ جو اپنی بزم میں آنکھیں چرا گئے | کھوئے گئے ہم ایسا کہ اغیار پا گئے

وہی الٹی پلٹی ترکیبیں ہیں اور حسن ایسا پیدا ہو گیا ہے کہ سبحان اللہ سبحان اللہ وہ فرماتے ہیں کہ رات اپنی بزم میں جو اُسنے ہمیں چرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا تو ہم کھو گئے اور اس کھو جانے یعنی بیہوشی کو اغیار پا گئے اور تاڑ گئے کہ یہ فیض دزدیدہ نگاہی کا ہے۔ چرانا۔ کھونا۔ پانا۔ معمولی الفاظ ہیں اور شعر اس قدر بلند ہے۔

غالب نے تتبع انکا کیا ہے اور خوب کیا ہے انکا بھی شعر سنئے

لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں | لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا

مگر

اُمید ہے لطفِ دوستاں سے کہ اتنا فرمائیں سب زبان سے
کیا ہے ناسخ نے آسماں سے بلند مرتبہ اس زمین کا

لفظوں کے ہیر پھیر کو مومن کے مقابلہ میں غالب کے اشعار میں اور بھی دکھاتا ہوں سنئے۔

مومن

بیمارِ اجل چارہ کو گر حضرتِ عیسےٰ | اچھا بھی کرینگے تو کچھ اچھا نہ کرینگے
موئے نہ عشق میں جب تک وہ مہرباں نہوا | بلائے جاں ہے وہ دل جو بلائے جاں نہوا
محو مجھ سا دمِ نظارۂ جاناں ہوگا | آئینہ۔ آئینہ دیکھیگا تو حیراں ہوگا
نیا کرم نہ کروگے اگر ابرام نہوگا | التزام سے حاصل بجز التزام نہوگا

غالب

درد منت کشِ دوا نہ ہُوا　　　میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں　　　تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
جان دی - دی ہوئی اُسی کی تھی　　　حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یہی صورت لفظِ یعنی کی ہے جسکا استعمال گو مومن سے پہلے کے اساتذہ میں بھی بڑے حُسن کے ساتھ میر وغیرہ نے کیا ہے مگر مومن نے اپنا رنگِ خاص میں اسکو داخل کر دیا ہے اور غالب نے اُنکا تتبع مناسب جانا ہے۔

مومن ؎

غمخانہ تنگ و تار ہے اور ہم سیاہ روز　　　جلتے ہیں یعنی - چاہیئے آٹھوں پہر چراغ
اظہارِ شوقِ شکوہ اثر اُس سے تھا عبث　　　یعنی کہا کہ مرتے ہیں تم پر - کہا عبث

رباعیِ غالب ؎

ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لئے　　　وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لئے
یعنی ہر بار صورتِ کاغذِ باد　　　ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کیلئے

اب ایک امر اور بھی عرض کرنا ہے کہ جب دوستوں نے مومن کو بھڑکایا تو اُنہوں نے یہ لکھا کہ ؎

مومن اُسی نے مجھ سے دی برتری کسیکو　　　جو پستِ فہم میرے اشعار تک نہ پہونچا

جب غالب کو لوگوں نے اشتعال دیا تو وہ یہ کہہ اُٹھے کہ ہاں ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے　　　کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

اب جو میں نے اوپر اکثر جگہ یہ عرض کیا ہے کہ رنگِ مومن میں غالب کا لکھنا تتبع ہے یہ اسلئے لکھا کہ عہد تو دونو کا ایک ہے مگر مومن کی گذرگاہ بے نقشِ پائے خضر تھی اور وہ غدر سے پہلے چلے ہی گئے غالب کو مومن کا دیوان مطبوعہ انکے بعد ملا اور کافی موقع تتبع کا ملا اسلئے کہ اگر مومن کی آزاد طبیعت یہ چاہتی کہ غالب کا

تتبع کریں تو غالب کے فلسفہ اور تصوف کی شان اُنکے کلام میں بھی پائی جاتی مگر نہیں ہے اور غالب نے بزورِ قوتِ آورد تتبع کرنا چاہا تو اطمینان سے کیا اور کامیاب بھی ہُوتے۔ غالباً اس منصفانہ رائے سے اہل نظر اتفاق فرمائینگے۔ اور نہ مانیں تو میرا زور بھی نہیں۔ شما بخیر دا بہ سلامت۔

جراح کیا سونچا تہا۔ کیا رنگ دیکھا۔ کیا ہُوا　　　کیوں کھول لی پٹی مرے زخم جگر سے باندھ کر

مطلب اسکا جو مولوی امتیاز احمد صاحب۔ بی۔ اے۔ نے لکھا اس سے بہتر مطلب تو کوئی بتا ہی نہیں سکتا یعنی جراح نے پٹی زخم جگر سے باندھی اور کھول لی۔ ظاہر ہے کہ پٹی باندہ کے کھول لینا کسی سبب پر مبنی ہوگا۔ مجروح۔ جراح کے اس فعل کو دیکھ کے سوال کر اُٹھتا ہے کہ جراح تو نے کیا سوچا تہا۔ مگر کوئی جواب نہیں ملتا۔ دوسرے سوال کی ضرورت پیش آتی ہے کہ کیا رنگ دیکھا۔ مگر جراح کی طرف سے خاموشی ہے زخمی پھر پوچھتا ہے کہ کیا ہوا۔ یہاں آکر مصرع ختم ہوگیا ہے اب جراح کا طرز دیکھئے مجروح کا پے درپے سوال کرنا (جو بیقراری کی علامت ہی) اس پر جراح کی خاموشی یہ مومن ہی سے بڑے شاعر کا کام تہا جو اتنی کامیابی کے ساتھ اپنے فرض سے عہدہ برآ ہوا ہے۔

اب اس مطلب کے ضمن میں مجھے اسیقدر کھول کر کہدینا ہے کہ جراح نے اک معمولی زخم جان کے پٹی باندہ دی تہی۔ مگر جب اسکو پتہ چلا کہ یہ زخم جگر ہے اور جگر کا زخم اچھا نہیں ہوتا تو اس نے اسکو فعل لاطائل سمجھ کے اور علاج فضول جان کے پٹی ہٹالی مگر مجروح کو اک وحشت سی ہوگئی ہے اور وہ یہ کہ اُٹھتا ہے کہ ؎ آتش

عزیزوں کو دوا سے جب کے حق بڑھتا نظر آیا　　　مجھے تقدیر پہ چھوڑا مری تدبیر کم کردی

میں پھر بھی کہونگا اور ہزار بار کہونگا کہ بعوض تنقید کے اگر ایسے تشریح کرنے والے مومن کے نصیب سے پیدا ہو جائیں تو مومن کی حق تلفی کا عوض ہو سکتا ہے

کہتے ہیں تمکو ہوش نہیں اضطراب میں ۔ سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

یعنی پہلے ہوش کی دوا کیجئے تب عرضِ حال کیجئے گا۔ اب اک بدحواس آدمی کے گلہ کا وزن

بیاراہا اسی زمین میں غالب کی استادی سنئے کہ ؎

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں ۔ میں جانتا ہوں جو وہ لکھینگے جواب میں

ان دونوں کے داخلی مضامین کے آگے ذوق کا بھی چراغ جلا دیتا ہوں گو روشنی

نہیں بہلتی ؎

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں ۔ واں ایک خامشی مرے سب کے جواب میں

اب آپ ہی خدا لگتی کہئے کہ اس خارجی مضمون کا کوئی وزن ان مضامین کے سامنے

نہیں ہے اور ہرگز نہیں مگر آپ اس پر بھی بیدار نہوں اور دن چڑھے تک سوتے

رہیں تو میں بجز اسکے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ ؎

پہلو سے اٹھ کہ جلد سے وہ صبح ہو چکی ۔ لیکن جنابِ عرش ابھی تک ہیں خواب میں

کر علاج جوشِ وحشت چارہ گر ۔ لا دے اک جنگل مجھے بازار سے

اے طبیب تو علاج جوشِ وحشت کرنے آیا ہے۔ ارے یہ جنونِ عشق ہے ایسے

بیمار کا علاج یہی ہے کہ اگر کسی عطار کی دوکان میں صحرا بکتا ہو تو وہ خرید کے

لا دے کہ دیوانگی میں سکون ہو۔ ورنہ تو خود دیوانہ ہے کہیں عشق کے دیوانے

کی دیوانگی بھی جا سکتی ہے۔

مرگ ہی انتہائے عشق یہاں ہے ابتدائے عشق ۔ زندگی اپنی ہو گئی رنجشِ بار بار میں

زندگی اپنی ہو گئی کیا اچھی زبان ہے - کیا پیارا روزمرہ ہے یعنی زندگی ختم ہو گئی

ابھی عشق کی ابتدا ہی تھی کہ ہم رنجش بار بار کی بدولت مر گئے ہمیں تو اسکی انتہا

کیا ہے اسکی خبر بھی نہیں۔

چرخ و زمین میں توبہ کا ملتا پتہ نہیں ۔ ہنگامہ بہار و ہجومِ سحاب میں

ہنگامہ بہار کی طرح ہجوم سحاب کی ترکیب بھی نہایت ہی پسندیدہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں
کہ بہار کے ہنگامے اور بدلیوں کی کثرت میں توبہ تو گم ہوگئی کہیں پتہ نہیں لگتا۔ یہ وقت
عیش ونشاط ہے اسوقت اُسکی تلاش کا موقع ہے

اے مومن آپ کب سے ہوئے بندۂ بتاں　　　　بارے ہمارے دین میں حضرت بھی آگئے

ع۔ کند ہمجنس با ہمجنس پرواز۔ ہر شخص دنیا میں اپنا ہمخیال ڈھونڈھتا ہے اور
جب اسکو کوئی مل جاتا ہے تو بڑی مسرت ہوتی ہے۔ اسی طرح تم سمجھ لو کہ اک آزاد
منش آدمی کوئی بتاں میں مومن کو پاکے تعجب کے ساتھ پوچھتا ہے کہ حضرت آپ
کدھر تشریف لائے آپ تو ان باتوں سے کنارہ تھے مسجد تھی اور آپ کی خدا پرستی
یہ بتوں کے بندے ہوکے بندگی کب سے اختیار کی۔ خیر
شکر صد شکر کہ ہمارے دین کو اختیار کیا۔ لیجئے قشقہ کھینچئے۔ ناقوس بجایئے۔ اور
دیر میں بتوں کو سجدہ کیجئے

اُس کوچہ میں جا مرینگے مدد اے ہجوم شوق　　　　آج اور زور کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم

ذی شخص کو کسی کار مشکل کے انجام دینے میں طاقت صرف کرنیکی اسقدر
ضرورت نہیں ہوتی جتنی کہ ایک کمزور کو ہوتی ہے۔ مقصد شاعر کا یہ ہے کہ اب
بڑھانی ہے کہ جسطرح ہو اس کوچے تک اس ضعف میں ہی چلے جائیں چاہے
وہاں پہونچ کے مرہی کیوں نہ جائیں اسلئے اپنی ناطاقتی کے ساتھ ایڑی چوٹی
کا زور لگاتے ہیں۔ خدا مدد کرنے والا اور مجھ بیمار ضعیف پر رحم کرنے والا ہے
منزل آسان کر دیگا۔

دن رات فکر جو رہیں۔ کیوں رنج اُٹھانا کب تلک
میں بھی ذرا آرام لوں تم بھی ذرا آرام لو

بنگال والے شعرا تو دیوتا جانتے ہیں۔ اسلام الشعرا تلاندالرحمن کا دعوے

کرتا ہے۔ انگلستان ملٹن کی رائے سے اتفاق کرتا ہے جو شعر میں جوش و اصلیت نہیں تو کچھ نہیں۔ ان باتوں کو مد نظر رکھ کے محسوسات کو معقولات پر ترجیح دیتے ہوئے ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ مومن نے یہ شعر ایسا لکھا جسمیں بنگال اور عرب کہ انگلستان تمام کے باشندوں کی پسندیدگی کا جوہر موجود ہے وہ کہتے ہیں۔ رات دن فکر جور نو ایجاد میں خواہ مخواہ کیوں اپنے کو خبط کئے ہو آخر دماغی محنت تمہیں پاگل بنا کر چھوڑے گی۔ میری رائے ہو کہ رنج نہ اٹھاؤ بلکہ اب (آرام) لو کہ دماغ میں تازگی آجائے اور میں بھی رنج سہتے سہتے خوگر رنج ہو گیا ہوں اور چونکہ رنج کی حس نہیں ہوتی اسلئے ذرا آرام لوں۔ اسکے بعد تمہیں بھی ظلم کرنے میں اور مجھے بھی مظالم کے سہنے میں لذت حاصل ہوگی۔ اس سے بہتر اور نیچرل شاعری کیا ہوگی۔ میر تقی میر بھی اسی انداز کو مد نظر رکھ کے فرماتے ہیں کہ ؎

ضعف بہت ہے میر تمہیں کچھ اسکی گلی میں مت جاؤ ۔۔۔ صبر کرو کچھ اور بھی صاحب طاقت جی میں آنے دو

ربط اس سے ہے مثل شعلہ و شمع ۔۔۔ مر جاؤں گر ایکدم جدا ہوں

عجب مسئلہ اس شعر میں حل کرتے ہیں جسطرح وہ کیڑا جسکو سمندر کہتے ہیں آگ میں رہنے سے زندہ رہتا ہے باہر آیا اور مر گیا۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ میرا اُسکا ساتھ شعلہ و شمع کا ساتھ شعلہ اگر چاہے کہ شمع سے الگ ہوکے باقی رہیں تو فوراً اکافور ہو جائے ۔

کس کی خبر ہے آنے کی ۔ کس لئے ہے یہ بیتابی

کس لئے ہیں ہم ہر دم پھرتے ۔ آتے اور جاتے ہیں

ایسے ہی اشعار سہل ممتنع کہے جاتے ہیں کہ دیکھنے میں صاف مگر کہنا مشکل وہ فرماتے ہیں کہ آخر یہ کسکی آمد میری بیتابی کو بڑھائے ہوئے ہے کہ ہر دم بیچین ہوکے ہم دوڑے پھرتے ہیں کبھی گھر سے باہر جاتے ہیں اور کبھی باہر سے اندر آتے ہیں کھلتا نہیں کہ کسکے انتظار نے یا کسکے وعدہ نے اس گت پر پہونچا رکھا ہے شاید وہی آرہا ہے

میر تقی صاحب فرماتے ہیں کہ ؎

وہ دیکھنے ہمیں ٹک بیماری میں نہ آیا سو بار آنکھیں کھولیں بالیں سے سر اٹھایا

ہائے اس بوڈھے نے تو مار ڈالا۔ کیا کہتا ہے کیا کیا نقشے کھینچتا ہے سبحان اللہ سبحان اللہ خیر کہنا یہ ہے کہ مومن نے اپنے شعر میں جس آب و رنگ سے کام لیا ہے اے کاش وہ ایسے سو دو سو شعر بھی لکھ جاتے تو یہی کہا جاتا کہ میر صاحب پھر مومن کے روپ میں آسمان سخن سے اترے ہیں۔

تو کہاں جائیگی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہونگے

یہ شعر بھی لذت درد میں ڈوبا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہمکو اپنے سے زیادہ غم تو اے شب ہجراں تیرا ہے آگے تو جب تیرا جی چاہتا تھا آکے میری مہمان ہو جاتی تھی اب تو یہ فیصلہ ہے کہ کل ہم خواب عدم میں ہونگے پھر تو کسکے گھر جائیگی اور کون تجھے پوچھیگا۔ کہنے کو تو داغ نے بھی اک شعر قریب قریب اسی انداز میں کہا ہے مگر استغفراللہ بہ بین تفاوت رہ از کجا است تا بہ کجا ؎

کہیں دنیا میں نہیں اسکا ٹھکانا اے داغ چھوڑ کر مجکو کہاں جائے مصیبت میری

ذوق بھی مومن کو نہ پا سکے یہ داغ چہ رسد۔

عیش میں بھی تو نہ جاگے کبھی تم کیا جانو کہ شب غم کوئی کس طرح سحر کرتا ہے

یہی وہ درد ہے جس سے غالب کا دیوان محروم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شب غم کسطرح تیرا عاشق مر مر کے سحر کرتا ہے اسکی خبر اسکو کیا جو کبھی شب وصل عیش میں بھی جاگا ہو ان باتوں کو وہ جانیں جنھے راتیں جاگ کے کاٹی ہوں۔ یعنی بقول غالب ع

صبح کرنا شام کا۔ لانا ہے جوئے شیر کا

اب یہ حالت ہو کہ اے پردہ نشیں تجھسے احباب چھپاتے ہیں مجھے

آہ جلبہر دیکھو سوز و گداز ہی نظر آتا ہے۔ یہ فرماتے ہیں کہ ہائے میری حالت تیرے عشق میں

یہاں تک نوبت ہوگئی کہ جب ذکر میرا تیری بزم میں آجاتا ہے تو احباب اخفائے راز کے خیال سے اظہار حال کرنا یا میرے گھرا کے مجکو بستر مرگ پر دکھانا نہیں چاہتے اس لئے کہ تو بیچین ہو جائیگا۔ یہاں پردہ نشیں کے مقابلہ میں چھپا بجز مومن کون لکھ سکتا تھا اس اقلیم بیاں پر ازل سے انہیں کا قبضہ ہے۔

بسکہ اک پردہ نشیں سے دل بیمار لگا   جو طبیبوں سے چھپاتے ہیں وہ آزار لگا

وہی مسئلہ۔ پردہ نشیں اور چھپانے کا پیش ہو مگر بیان بدلا ہوا ہے یہاں کہتے ہیں کہ ہائے قسمت دل بھی لگا تو اک پردہ نشیں سے۔ مرض بھی ہوا تو عشق و محبت کا جسکو لوگ طبیب تک پر ظاہر نہیں کر سکتے۔ اب امید شفا کیا رکھیں۔ اسکا محال اور موت اسمیں لازمی چیز ہے۔

مومن سوئے شرق اس بت کافر کا تو گھر ہے   ہم سجدہ کدھر کرتے ہیں اور کعبہ کدھر ہے

مومن کہتے ہیں کہ جب عشق بت کافر ہے تو پھر سجدہ اپنے کعبۂ مقصود کی طرف کیوں نہیں کرتا کیونکہ آفتاب پرست سوئے شرق سجدہ سلام کرتے ہیں تیری ترکیب الٹی ہے کہ عرض یورپ کے مسلمانوں کی طرح مشرق کی طرف سجدہ کرتا ہے۔ اور امید رکھتا ہے کہ یہ سجدہ قبول ہوگا۔ اسے میاں اسکا رام ہونا معلوم

مومن تم اور عشق بتاں اے پیر و مرشد خیر تو ہے

یہ ذکر اور منہ آپکا صاحب خدا کا نام لو

خدا کا نام لو۔ محاورہ یہ اس موقع پر استعمال ہوتا ہے جیسے کوئی کہے کہ کہاں ہو۔ کیا بکتے ہو ہوش میں آؤ۔ اسی طرح پیر و مرشد بھی لوگ شفیق حاکم اور مہربان کیجگہ مذاق سے بولتے ہیں خیر تو فرماتے ہیں کہ عشق الہی کو تو جانے دو اجی تم سے عشق بتاں کا حق تو ادا ہی نہیں ہو سکتا ہے یہ ذکر اور آپکا منہ۔ خدا کی شان پہلے بتوں کے ذکر کے قابل تو ہو لو پھر ذکر حق کرنا۔ مجازمیں قدم ہی نہیں رکھا حقیقت کی تلاش ہو گئی۔

اب ہم بہ تقلید دیگر ذیل کے تین اشعار پیش کر کے تنقید کی بہار دکھاتے ہیں۔ سنیئے

میرؔ — میرے تغیر حال پر مت جا — اتفاقات ہیں زمانے کے

دردؔ — میرے تغیر حال پر مت جا — یوں بھی اے مہرباں ہوتا ہے

مومنؔ — میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ — تجکو اپنی نظر نہ ہو جائے

ایک شاعر کہتا ہے کہ یہ سب اتفاقات ہیں جو میرا حال بگڑ گیا۔ دوسرا کہتا ہے کہ میرے حال کے تغیر پر تعجب نہ کر مہربانِ من ایسا ہوتا ہے۔ مومن کہتے ہیں کہ میرے تغیر رنگ پر غور مت کر اگر غور کریگا تو تجکو اپنی نظر آپ ہو جائیگی اسلئے کہ یہ تیرے ہی عنایات کے بدولت ہوا ہے۔ جب تو اسکو محسوس کرلیگا اور سمجھ لیگا کہ تجکو وہ قوت حاصل ہے کہ انقلاب پیدا کر کے عالم اجسام کی ہستی کو بھی نیستی تک پہونچا دے تو تجھے اپنی نظر آپ ہو جائیگی۔ ناظرین خود انصاف کر دیں کہ نزاکت مضمون کس شعر میں ہے۔

خوشی نہ ہو مجھے کیونکر قضا کے آنے کی — خبر ہے لاش پہ اُس بے وفا کے آنے کی

موت کے آنے سے کون ڈرتا ہے آ مجھے مسرت ہے یہ اسلئے کہ اُس نے عہد کر لیا ہے کہ میرے جیتے جی نہیں آئینگے جب تو مر جائیگا تب آئینگے اسلئے اُنکا آنا میری موت کے آنے پر منحصر ہے۔ اب میں کہتا ہوں کہ جھوٹوں کے قول کا کیا اعتبار کہیں مر کے پچھتانا نہ پڑے۔

میں اگر آپ سے جاؤں تو قرار آ جائے — پر یہ ڈرتا ہوں کہ ایسا نہ ہو یار آ جائے

اس شعر کی ترکیب کو کیا کہئے۔ بس یہ مومن کا کام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ سے جاؤں یعنی بیہوش ہو جاؤں تو بیہوشی کے سبب تکلیف دردِ دل تو عدم محسوس کے سبب ضرور جاتی رہیگی۔ مگر ڈر تو یہ ہے کہ اگر اسی وقت یار آگیا تو میں اسکو دیکھ نہ سکوں گا نہ اُس سے باتیں کر سکونگا اس سے اچھا ہے کہ بیقرار ہی رہوں۔ دنیا اُمید پر قایم ہے شاید وہ آ ہی جائے۔

وعدہ کرکے وہ نہ آئے نامہ بر — تو نے پوچھا ہوئیگا تکرار سے

وعدہ کرکے وہ اور نہ آئے یہ کوئی بات ہے اس سے زیادہ سچا تو دنیا میں کوئی ہے نہیں اب رہ گئی یہ بات کہ اے نامہ بر تو نے بار بار وعدہ لیا ہوگا اسلئے وہ چڑھ گیا اور نہیں آیا یہ قصور تیرا ہے کہ اسکا" ہاں خانصاحب ہاں جھوٹی تسکین آپ کے قابو کی چیز ہے کر لیجئے۔ رر

جا بجا نہریں ہیں جاری میں نے اشک — پوچھے ہونگے دامنِ کہسار سے

یہ لکھنؤ کا انداز اور استعارہ شاہ نصیر صاحب کی درگاہ کا تبرک ہے۔ مطلب تو شعر کا یہی اتنا ہے کہ پہاڑوں کے دامن میں نہریں کہاں سے آسکتی تھیں میں نے عالمِ وحشت میں رو رو کے ان کے دامن سے آنسو پوچھا ہے۔ اس رنگ سے غالب بھی خالی نہیں ہیں ~

آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا — تجھ پہ کھل جائے کہ اسکو حسرتِ دیدار ہے

بہرحال اس رنگ کے اشعار سے تو ذوق بھی نہیں بچے ~

ہائے رے حسرتِ دیدار کہ ہاتھ کو بھی — لکھتے ہیں ہائے دو چشمی سے کتابت والے

مگر قول فیصل یہ ہے کہ اگر یہی مستقل رنگ مومن و غالب کا ہوتا تو بندہ کا سلام۔ ناسخ کے دامن کی ہوا سے میر کا گلشن بھی خالی نہیں ہے ~

مردمِ دیدۂ تر مردمِ آبی ہیں مگر — رہتے ہیں روز و شب شام و سحر پانی میں

بہرحال یہ وقت کا اثر۔ استاد تسلیم اپنی آنکھوں کی دیکھی ہوئی فرماتے تھے کہ لکھنؤ میں پھٹے گریبان کا بیابان والا وہ مشاعرہ دیکھا تھا جس میں۔ لال کھاروے کی لنگی اور ڈھاکہ کے ململ کا کرتا پہنے ہوئے ناسخ اک سبز مخمل کی مسند پر بیٹھے تھے۔ پھولوں کا پنکھا ہلتا تھا یہ سب شعر اسی مشاعرے کے ہیں۔

~ ناسخ: مرا سینہ ہے مشرقِ آفتابِ داغِ ہجراں کا — طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

؎ وزیر نہیں انبوہِ خط میں جلوۂ حسنِ رخِ جاناں کا عیاں ہے تخت پہ پریوں کی جھرمٹ میں سلیماں کا

؎ اسیر ازل سے سلسلہ ہے اس جنونِ فتنہ ساماں کا شگافِ خامۂ کن چاک ہے میرے گریباں کا

؎ آتش لبھاتا ہے نہایت دلکو خطِ رخسارِ جاناں کا گھسیٹے گا مجھی کانٹوں میں سبزہ اس گلستاں کا

؎ تسلیم لکھا ہے یکقلم مضمون صنعت ہائے یزداں کا جوابِ دفترِ کن ہر ورق ہے میرے دیوان کا

اسی موقع پر نسیم دہلوی نے یہ اشعار پڑھے تھے۔ وقت کے اثر سے دلی کے سفید پوشوں کے دامن پر بھی دو چار چھینٹیں اس رنگ کی موجود ہیں دیکھ لو۔

؎ نسیم اثر پیدا کیا ہے پیرہن نے جسمِ بیجاں کا نہیں دیتا ابھی تک زخمِ نو چاکِ گریباں کا

ہٹا نو ابرِ گیسو جلوۂ عارض میں فرق آیا نقابِ شام سے منہ چھپ گیا صبحِ گلستاں کا

داغ کو ہزار ہزار آفریں جو اس ہنگامہ کو رامپور میں رات دن دیکھ رہا تھا مگر لکھنو والوں سے بالکل الگ کے دلی کے نام کو روشن کرتا رہا اور اُسیکو حالی نے لکھا تھا کہ ؎

داغ و مجروح کو سُن لو کہ پھر اس گلشن میں نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

میرے سینے پہ قدم زور سے مت رکھ ظالم ہاں نہ چبھ جائیں کفِ پا میں کہیں دلکے خار

لے سبحان اللہ کیا نازک خیالی ہے کہتے ہیں کہ ہاں ہاں میری چھاتی پر قدم زور سے مت رکھ تیرے تلوے اے نازنین بڑے ملایم ہیں کہیں انمیں خارِ غم نہ چبھ جائیں۔

غالب کی ہمنوائی بھی ملاحظہ کر لیجیے وہ پاؤں کی نزاکت کو فرماتے ہیں کہ ؎

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پاؤں

بارک اللہ کیا کہنا۔ غالب نے غلو سے کام لیکر شعر کو مومن سے زیادہ بلند کر دیا ہے مگر بیان کی لطافت جو مومن میں ہے وہ غالب میں نہیں۔ آمد اور آورد کا فرق ظاہر ہوتا ہے

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہونگے

اس پھر کی تکرار نے شعر کے لطف کو بڑھا دیا ہے۔ اور اندازِ بیان بھی مستانہ ہے۔ مطلب تو صاف ہے اور اسی قدر ہے کہ صبر و سکون کے نام الوداعی فاتحہ پڑھ کر

پھر بہار آگئی۔ اب پھر وہی دشت نوردی اور پھر ہمارے وہی تلوے اور ببول کے کانٹے ہونگے۔

چھٹ کر کہاں اسیر محبت کی زندگی   ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

یعنی او ناصح سمجھ کے نصیحت کر مرے بندِ غم کو نہ توڑ کہ اسی کی بقا تک مجکو بقا ہے۔ ورنہ جہاں اس سے چھوٹے پھر ہم ہیں اور فنا ہے۔ غالب بھی اسی بندِ غم کو لکھتے ہیں ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں   موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

فرق ان دونوں شعروں میں اتنا ضرور ہے کہ مومن کی ترکیب پیچیدہ ہے اور غالب نے نئی روشنی اور پسندیدگی کو مدِنظر رکھ کے جو کچھ لکھا ہے عام فہم ہے۔

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے   کہیں صحرا میں گھر نہ ہو جائے

گھر میں رہ کے صبر کرنا چاہا تو جذباتِ عشق نے جنوں پیدا کر دیا یہانتک کہ گھبرا کے صحرا میں چلے آئے اب جو یہاں آئے ناصح بھی صبر سے کام لینے کو کہتا ہے تو ڈرتا ہوں کہ صحرا بھی گھر کی طرح وحشت زدہ نہ ہو جائے پھر بڑی مشکل ہوگی۔ یہاں سے کہاں جائینگے

سُنا اُسنے مرا نالہ اثر بھی کچھ ہوا شاید   کہ دشمن کہ گیا۔ بے فائدہ کیوں غل مچاتا ہے

ہاں واقعی قرین قیاس ہے اُسنے آنجناب کا نالہ کرتے ہوئے ضرور سنا اور اُس کے دل میں کچھ اثر بھی ہوا یہانتک کے اس نے آپکے رقیب سے پوچھا کہ کس دردمند کی آواز ہے مگر جب دشمن نے یہ دیکھا کہ کہیں وہ مسخر نہ ہو جائے تو آپ سے یہ آکے کہتا ہے کہ کاہے کو غل مچا رہا ہے فضول کوئی سُنے بھی غرض یہ کہ عدو اپنے گون کا رہے آپ اپنی ہی سعی کئے جا ئیے۔

خیالِ خوابِ راحت ہو علاج اس بدگمانی کا   وہ کافر گور میں مومن مرا شانہ ہلاتا ہے

یعنی اسکو یقین موت کہاں ہے مومن ہو جب نہ میری موت پر یقین کرے وہ تو کافر ہے یہ سمجھ رہا ہے کہ مکاری سے اُسنے آنکھیں بند کر لی ہیں خیر قبر میں بھی چھپ جا ئیے

پڑے ہیں ہو علاج اس بدگمانی کا بس یہی ہے کہ کم سے کم وہ شانہ تو ہلا رہا ہے۔ اگر مر گئے ہو تو بھی مبارک زندہ ہو تو بھی مناسب۔

خیالِ اجل سے تسلی کروں
وہ طاقت بھی جانِ حزیں ہو چکی

اسی ضعف کو لکھنو والوں نے کس کس طرح لکھا ہے اور رائی کو پہاڑ بنایا ہے مگر بجز بلاغت لطف نہیں واں نہیں مومن کا مقصد یہ ہے کہ طاقتِ جانِ ناتوان یہاں تک زائل ہو چکی کہ اب اسمیں اتنی بھی قوت نہیں کہ کم سے کم وہ موت کے آنے کا تصور کر سکے اور اسی آس پر زندہ رہے۔

کیونکر نہ کہیں منت اعدا نہ کریں گے
کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

صاحب یہ منہ کہاں جو کہیں کہ ہم دشمنوں کی خوشامد نہ کرینگے۔ برا ہو اس عشق کا کیا کیا نہ کیا اور جانیں ابھی اور کیا کیا کرینگے۔

مانگا کرینگے اب سے دعا ہجرِ یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کیساتھ

کیا بلند اور اچھوتا مضمون لکھا ہے فرماتے ہیں کہ جب اثر کو میری دعا کے ساتھ دشمنی چلی آتی ہے تو اب ہمیں بھی ضد ہے بعوض وصلِ یار کے ہم ہجرِ یار کی دعا مانگا کرینگے تاکہ نتیجہ برعکس ظاہر ہو یعنی بعوض ہجر وصلِ یار حاصل ہو جائے۔ اور اس الٹ پھیر میں اپنی بات بن جائے۔

حضراتِ ناظرین۔ ان افسانوں کو آپ کہاں تک سنینگے۔ اختصار کو مدنظر رکھ کے ان چند شعروں کی تنقید و تشریح کر دی ہے ورنہ

جو اس شور سے میر روتا رہیگا
تو ہمسایہ کاہیکو سوتا رہیگا

دنیا خالی نہیں۔ خدا نے بہتر سے بہتر دماغ والوں کو پیدا کیا ہے وہ اس کام کو مجھ سے زیادہ اچھا کر کے دکھلا سکتے ہیں مگر ہاں جو اہلِ انصاف ہیں وہ انشاء اللہ یہی کہینگے کہ

حسن تو نے لکھی جو یہ مثنوی
نہ ایسی ہوئی ہے نہ ہوگی کبھی

اچھا اب لگے ہاتھوں مومن کی روح پاک کو اک سورۂ فاتحہ کا ثواب پہونچا دیجئے اور انکی ان چند غزلوں کو بھی سُن لیجئے۔ جنکو مطبوعہ کلیات سے لیا ہے۔

جوہر کلام مومن

گر وہاں بھی یہ خموشی اثرِ افغاں ہوگا
حشر میں کون مرے حال کا پرساں ہوگا

کیونکر امیدِ وفا سے ہو تسلی دل کو
فکر ہے یہ کہ وہ وعدے سے پشیماں ہوگا

دردِ دستِ جاناں سے عدو ہر رگ و پے میں سمائے
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

شومیٔ بخت تو ہے چین نہ لے لے وحشتِ دل
دیکھ زنداں بھی کوئی دن میں بیاباں ہوگا

نسبتِ عیش سے ہوں نزع میں گریاں یعنی
ہے یہ رونا کہ دہن گور کا خنداں ہوگا

دوستی اس صنمِ آفتِ ایماں سے کرے
مومن ایسا بھی کوئی دشمنِ ایماں ہوگا

ٹانکنے چاکِ گریباں کو تو ہر بار لگا
ہاتھ کھینچا اور جو ناصح رہے اک تار لگا

جذبۂ دل کو نہ چھاتی سے لگاؤں کیونکر
آپ وہ میرے گلے دوڑ کے یکبار لگا

دیکھ تو حسرتِ دیدار پسِ مرگ بھی
آنکھیں وہ کھول کے تکنے در و دیوار لگا

کعبے سے جانبِ بتخانہ پھر آیا مومن
کیا کرے جی نہ کسی طرح سے زنہار لگا

ذیل کی غزل تو روزمرہ اور زبان کے لحاظ سے ایسی لکھی ہے کہ صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مومن امۃ الفاطمہ بیگم عرف صاحب جی کے سامنے بیٹھے ہوئے رو رہے ہیں اور یہ اشعار پڑھ رہے ہیں۔ انگلیوں کی کنگھی زلفوں میں چل رہی ہے اور وہ خاموش بیٹھی ہوئی انکا منہ دیکھ رہی ہیں۔ اللہ اللہ اس تصویر کو کھنچے ہوئے اک صدی گذرنے آئی مگر رنگ و روغن نہ بگڑا۔

غزل

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو — وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پہ — مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں — وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم — گلۂ ملامت اقربا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی — کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

دوستو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا — سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کہا میں نے بات وہ کوٹھے کی مرے دل سے صاف اتر گئی — تو کہا کہ جانے مری بلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ کہتے تھے باوفا جسے آپ کہتے تھے آشنا
میں وہی ہوں مومن مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اس پری وش سے لگاتے ہیں مجھے — لوگ دیوانہ بناتے ہیں مجھے

یارب ان کا بھی جنازہ اٹھے — غیر اس کوچے سے اٹھاتے ہیں مجھے

حیرت حسن سے یہ شکل بنی — کہ وہ آئینہ دکھاتے ہیں مجھے[۱۲]

جان گئی پر نہ گئی جورکشی — بعد مردن بھی دباتے ہیں مجھے

مومن اور دیر خدا خیر کرے
طور بے ڈھب نظر آتے ہیں مجھے

غزل ذیل کی ردیف زبان قدیم سے وابستہ ہے مگر جو لطف اسکا صاحبان طبع سلیم کو آج بھی میسر ہے وہ زبان حال میں اسکا حاصل نہیں ہو سکتا ہے انداز غزل اتنا پاکیزہ ہے جیسے ابھی گلاب کے درخت میں پھول کھلے ہیں اور اسکی خوشبو سے سارا باغ معطر ہو رہا ہے اسکی نگہتوں پہ بلبلیں لوٹ رہی ہیں —

غزل

---

۱۲ یعنی ذرا صورت شریف ملاحظہ فرمائیے

ستم نگاہِ لطف دشمن پر جو بندہ جائے ہے
یہ ستم لے بے مروت کس سے دیکھا جائے ہے

حالِ دل کیونکر کہوں میں کس سے بولا جائے ہے
سر اٹھے بالیں سے کیا کچھ جی ہی بیٹھا جائے ہے

جان نہ کیا وصلِ عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں
جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے

رشکِ دشمن نے بنا دی جان پر اے بے وفا
کب تلک کوئی نہ بگڑے حال بگڑا جائے ہے

حسنِ روز افزوں پہ غرّہ کس لئے اے ماہرو
یونہیں گھٹتا جائے ہے جتنا کہ گھٹتا جائے ہے

غیر کے ہمراہ وہ آتا ہے میں حیران ہوں
کس کے استقبال کو جی تن سے میرا جائے ہے

تاب و طاقت صبر و راحت جان و ایمان عقل و ہوش
ہائے کیا کہئے کہ دل کے ساتھ کیا کیا جائے ہے

خاک میں مل جائے یارب بیکسی کی آبرو
غیر میری لاش کے ہمراہ روتا جائے ہے

دیکھئے انجام کیا ہو مومنِ صورت پرست
شیخ[1] صنعا کی طرح سوئے کلیسا جائے ہے

تقریظ و تاریخ

تقریظ از گوہر سنجابت دریائے علم و لیاقت عزیز بیگم صاحبہ دہلوی

ہواخواہانِ چمنستانِ سخن کو مژدہ کہ میر بہار ادیب روزگار حضرت مولانا عرشؔ نے سالہا سال کی جانکاہی کے بعد ہمارے دادا جان فخرِ ہندوستان حکیم مومن خاں دہلوی کے صحیح حالات تاریخ مومن نام اک کتاب میں مرتب کر کے اسکو سیّد صاحب ہمہ سخندان و سخنور ارسطوئے دوراں حکیم محمد جمیل خاں صاحب خلف مسیح الملک حکیم اجمل خاں مغفور دہلوی کے نام معنون فرمایا ہے۔

خدا لگتی کہوں گی کہ اگر اظہارِ حالاتِ غالب و ذوق کے لئے حالی و آزاد آئے تھے تو خداوند عالم نے عرشؔ سے نکتہ فہم کو مومن کے انکشافِ کمالات کے لئے بھیجا ہے۔

[1] ایک بزرگ مشہور کا نام ہے جو سیکڑوں مرید رکھتے تھے مگر عشقِ دختر ترسا کے بدولت منکرِ اسلام ہو جاتے اگر مرید بھی اُن کا [illegible]

ذرا دیکھئے گا کس انداز کی دلکش تحریر ہے کس اچھوتے عنوان سے اشعار مومن کی تشریح و تنقید کی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ لوہے کے چنے چبائے ہیں تعریف نہیں ہو سکتی حاسد منہ میں گھنگنیاں بھر کے بیٹھیں تو کیا کریں۔ گھر بیٹھے دعویٰ کرنا اور بات ہے مگر جو انصاف کی عینک لگا کے دیکھو تو چہ نظم و چہ نثر عرش کا جواب بہار اور بنگال میں نہیں ہے اور یہ پورب کے ایک باشندہ کا معمولی کارنامہ نہیں کہ میر انیس کا خاندان لکھنو میں اور حکیم شریف خاں کا خاندان دھلی میں اُسکی زباندانی اور کمال فن کا معترف ہو جو سچ پوچھو تو ؎

ہوا کرتی ہے زینت عیب سے رنگیں مزاجوں کی
سدا شبنم دھولا دیتی ہے منہ گلہائے خنداں کا

عرش صاحب کی عنایتوں کا احسان میرے سر آنکھوں پر اور صوبہ بہار کا احسان دلی کیا سارے ہندوستان پر جہاں کے ایک مورخ نے ایسی نادر کتاب لکھی۔ جب سے عرش صاحب نے دلی آکے تفتیش احوال مومن فرما کر میرے داغ دل کو تازہ کیا ہے ہچکیوں کا ہی تقاضا رہتا ہے کہ ؎

شمع بزم خاندان خاص تو ہولے عزیز
تربت مومن پہ چل آنسو بہانے کے لئے

خدا کرے مومن کے موہوم مزار پر کتبہ بھی لگ جائے اور وہ زیارت گاہ عالم ہو کر رہے۔ آمین

خاکپائے مومن عزیزہ بیگم دھلوی

تاریخ ترتیبِ سوانح مومن از اُستادِ کہن سال
عالیجناب مولانا مولوی ناصر حبیب صاحب ناصر وکیل ریاست
دتیا نواسہ حکیم مومن خاں صاحب مغفور

ایک مدت سے تھے اربابِ سخن سب منتظر | حضرتِ مومن کے حالات و سوانح کیلئے

عرش نے لکھکر حیاتِ مومنِ مرحوم کو | حسنِ تحقیقِ سوانح کو دکھائے معجزے

دادِ معنی پروری دی ہے بہت اچھی طرح | لکھے ہیں حالاتِ مومن خوب شرح و بسط سے

عرش شاگردِ رشیدِ حضرتِ تسلیم ہیں | وہ نسیمِ دہلوی کے خوشہ چینِ فیض تھے

اور نسیمِ دہلوی نے مومنِ مرحوم کی | خدمتِ اقدس سے پائے تھے یہ عالی مرتبے

مومنِ مرحوم کا ناصر نواسہ میں بھی ہوں | نسبتِ ذرہ ہو اُس خورشیدِ رخشاں سے مجھے

دل نے برجستہ کہا مصرعِ تاریخِ طبع
عرش والا جاہ نے حالاتِ مومن کے لکھے

۱۳۴۸ ھ

تاریخ

تاریخ از محقق بےمثال شاعرِ عالی خیال فخر التلامذہ استاد تسلیم حضرت مولانا سید شفیع احمد صاحب عالیؔ۔ وکیل بدایوں۔

جناب عرشؔ نے لکھا وہ تذکرہ جس سے — کھلے بہار پہ نکات حکیم مومن خان
تلاش ہے سن ترتیب کی اگر عالیؔ — لکھو بیان حیاتِ حکیم مومن خاں

۱۳۴۷ھ

تاریخ از نقادِ فن شمع بزم سخن عالی جناب ضیاء احمد صاحب بدایونی سابق لکچرار علیگڑھ یونیورسٹی و پروفیسر حال دہلی کولج (رشیدِ مومن)

تاریخِ مومن

۱۳۴۷ھ

عرشؔ نے لکھا وہ نادر تذکرہ — جسکے تھے مشتاق سب پیر و جواں
تازہ کردی عظمتِ رفتہ کی یاد — چھیڑ کر عہدِ کہن کی داستاں
اس شہِ اقلیمِ فن کا ہے یہ ذکر — شاعری میں تھا جو یکتائے زماں
مصرعِ تاریخ لکھ دو اے ضیاؔ — واقعاتِ مومنِ شیریں بیاں

۱۳۴۷ھ

طرزِ مومن سے نہ آگاہ تھے جب تک کہ ظہیر

سچ تو یہ ہو کہ کبھی لطفِ غزل نے نہ دیا

ذوق مومن غالب اپنی اپنی خصوصیتوں میں یکتائے روزگار گذرے ہیں۔ ان کے کلام کی خوبیاں ظاہری بھی ہیں۔ اور باطنی بھی۔ یعنی جو لوگ اس وادی کے رہ نورد اور تازہ وارد ہیں وہ بھی اور جن لوگوں میں سخن سنجی اور سخن فہمی کا ملکہ راسخہ کہنگی مشق و مہارت اور مبداءِ فیاض کے فیضان سے پیدا ہو چکا ہے وہ بھی انکے کلام کو پڑھتے ہیں اور وجد کرتے ہیں میرے نزدیک ان بزرگانِ اردو کا ایک دوسرے سے اس طرح موازنہ کرنا کہ ایک کے مقابلہ پر دوسرے کی تنقیص ہو۔ اور ایک کا کمال دوسرے کے کمال کے روبرو دب کے رہ جائے گناہِ عظیم ہے۔ میرے نانا حضرت ظہیر دہلوی مرحوم حضرت ذوق کے شاگرد خاص تھے۔ مگر آج شاگردانِ ذوق میں جو مرتبہ حضرت داغ اور حضرت ظہیر کو فن سخن میں ملا اور جو مقبولیت عامہ ان دونوں کے کلام کو ہوئی وہ بے نظیر ہے حضرت آزاد بھی شاگرد ذوق تھے۔ لیکن نظم و شعر ان کا میدان نہ تھا، وہ تو نثر اردو کے بادشاہ تھے۔ اور نثر لکھنے میں اتباع آزاد ایک محال و ممتنع چیز ہے آزاد کا طرز بیاں درحقیقت اپنی نظیر آپ ہے، وہ واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ گویا کاغذ کے پردہ پر چلتی پھرتی تصویریں ہیں جو ہر شخص کے روبرو بے نقاب ہیں۔ مثلاً لشکرِ عالمگیر کی دکن پر چڑھائی کا جو فوٹو کاغذ کے صفحات پر آزاد کے قلم نے پیش کیا ہے، آج کون ہے جو الفاظِ نثر میں مصوری کا اس سے بہتر حق ادا کرسکے۔

آسمانِ اردو کا ایک آفتاب، جناب غالب ہیں، غالب عالمِ معانی و بیان کے شہنشاہ تھے، زمانہ تھا کہ کلامِ غالب کے قدردان دب کے رہ گئے تھے مگر علومِ مغربیہ کی نئی روشنی

پھیلی، اور لوگوں نے غالب کو پڑھا اور سمجھا تو سر دھننے لگے۔ اور آج غالب کا سکہ
ہر قدردان اردو کے دل پر ہے۔ اسی طرح مطلع اردو پر ایک ماہ نیم ماہ جناب مومن ہیں
یہ نازک خیالی اور اثر و درد کی بولتی تصویر ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ذوق و غالب
و مومن دنیائے اردو کے یہ وہ اقانیم ثلاثہ ہیں، جن کے بغیر اردو، قالب بے
جان ہے۔ اور ایک کے مقابلہ پر دوسرے کی ہجو و تنقیص مذہب اردو میں ناقابل
معافی جرم ہے؛

ان سب کا اپنا اپنا رنگ ہے۔ اور اپنی جگہ ان میں ہر ایک بے نظیر ہستی رکھتا ہے،
مجھے نہایت خوشی ہے کہ جناب عرش گیاوی کی والہانہ کوششوں کی بدولت
آج مومن اپنی اصلی شان میں جلوہ گر ہیں، جناب ممدوح کو جو شیفتگی ذات مومن سے ہے
وہ جا بجا، انکے لکھے ہوئے اس تذکرۂ مومن سے ظاہر ہے، سچ تو یہ ہے کہ اپنی عقیدت
کیشی کا حق ادا کر دیا ہے، اور مومن کے قدردانوں پر ہی نہیں بلکہ اردو پر احسان
کیا ہے

دلی کے بے تاج بادشاہ، اور خاندان حکیم شریف خاں مرحوم کے چشم و چراغ
جناب حکیم محمد جمیل خاں صاحب نے جو آج اپنے والد ماجد مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب
مغفور کی مسند پر صورت و سیرت میں زندہ مسیح الملک ہیں مجھ سے فرمایا،
کہ میں اس کتاب کی طباعت کی ذمہ داری قبول کروں، اور میں نے اسے
خوشی و فخر کے ساتھ منظور کیا،

جناب حکیم صاحب کا خاندان، ہر مسلک اور ہر خیال کے شرفا کی محبت و عقیدت کا
مرکز نہ آج سے بلکہ کئی سو برس سے ہے، غالب، ذوق و مومن اور انکے شاگردوں
میں سے کون ہے جسے اس خاندان سے محبت کا تعلق نہیں رہا۔ یہ سب کے قدردان ہیں
اور سب انکے والہ و شیدا ہیں؛

اسی تعلق کی بنا پر انہوں نے اس تذکرہ مومن کا اپنے نام نامی سے معنون ہونا منظور فرمایا۔

اس تذکرہ میں ایک مقام پر، کا مدار خانی، وفادار خانی کشمیری سیدوں کے دو خاندانوں کا حوالہ دیتے ہوئے ایک سے مومن کا تعلق اور دوسرے سے مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کا تعلق بتلایا گیا ہے، لیکن جناب مولف کو صحیح اطلاع نہیں ملی۔ واقعہ یہ ہے کہ مسیح الملک کا خاندان سادات کشمیر کا خاندان نہیں ہے، یہ خاندان حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کی نسل ہے، جنہیں صدیوں تک پیرزادگی کا سلسلہ رہا اور عہد عالمگیر میں، جبکہ دہلی حضرت سید حسن رسول نما قدس سرہ کے فیوض و برکات سے مالا مال تھی، حکیم محمد اکمل خاں، اس خاندان میں وہ بزرگ گذرے ہیں، جو حضرت کے عقیدت مندان با اختصاص میں سے تھے۔

اور اس خاندان میں پہلے طبیب تھے، حکیم محمد اکمل خاں وہی بزرگ ہیں، جنہوں نے زوجہ اول کے انتقال کے بعد، عقد ثانی حضرت کے ایما و اشارہ سے کیا، اور آپ کی دعا تھی کہ خدا سات پشت تک اس خاندان میں ایسے لوگ پیدا کرے، جو فیض رسان عالم ہوں اور فخر خاندان۔ آج اس خاندان کی تاریخ شہادت دیتی ہے کہ خاصان برگزیدگان حق کی دعائیں، کس طرح مقبول و مستجاب ہوا کرتی ہیں پس اس پورے تذکرہ کو میں نے دلچسپی کے ساتھ پڑھا ہے اور محبت کی نظر سے، نہ کہ تنقید کی نظر سے کہ ہوتا یہ کتاب مومن کے لئے ایک خراج عقیدت ہے جس کا احترام ہر قدر دان اردو پر واجب ہے۔ "خاندان شریف" کے حسب و نسب کے متعلق یہ صراحت کبھی اس لئے کی گئی کہ جب یہ کتاب اس خاندان کے ایک فرد عالی کے نام سے معنون ہے اور یہ مقام یوں ہی باقی رہا اور مستند اور صحیح تاریخ کی بنا پر اسکی تصحیح کی گئی تو یہ درست کام نہ ہوگا۔ آئندہ مورخین کے لئے دشواری پیدا ہوگی۔ آخر میں عرض ہے کہ مجھے پورا یقین ہے

جناب عرشؔ نے عقیدتِ مومن کا پورا حق ادا کر دیا ہے میں ان کو مبارکباد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ قدردانِ زبان اور شیفتگانِ ادبِ اردو اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

سید اشتیاق حسین شوقؔ نبیرہ حضرت ظہیر مرحوم

تقریظ منظوم حیاتِ مومن

وحید العصر ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائلؔ دہلوی

جاگیردار ریاست لوہارو

مومن علم ہے جس کا ہے سلطانِ ریختہ
مسکن کا اسکے نام ہے ایوانِ ریختہ

روح و روانِ غزل کا ہے ایک ایک اسکا شعر
دیوان اسکا دیکھو ہے دیوانِ ریختہ

حالاتِ زیست اسکے اگر چاہو دیکھنے
دیکھو لگی ہے عرشؔ کی دوکانِ ریختہ

جوہر سے ہے ادب دانِ السنہ
نظمی نسق میں عرف ہے سحبانِ ریختہ

لکھکر سوانح حضرتِ مومن کی بالخصوص
باری کیا ہے نثر میں عمانِ ریختہ

احسان ایک روح پہ فرمایا عرشؔ نے
ممنون جس سے سب ہیں سخندانِ ریختہ

معجز نما زبان ہے معجز نگار کلک
ایک ایک لفظ نسخہ ہے ایمانِ ریختہ

جو حرف اسکا دیکھئے ہے خال منہ جبیں
ہر نقطہ اسکا مصدرِ دشتانِ ریختہ

اہلِ قلم کو زیب ہے تالیف ایسی ہی
ایسوں کی خامہ سائی ہے شایانِ ریختہ

تقریظ خواہ نسخہ ہوئے شوقؔ مجھسے آج
پیری میں ہوں میں طفلِ دبستانِ ریختہ

نسبت ہے کاملین کی ہوں روشناس خلق — ہم رنگ مور ہو فر سلیمان ریختہ
اصرار نے عزیز کے مجبور کر دیا — طے پا شکستہ کیا کرے میدان ریختہ
خامہ نے میرے کر دیا کچھ القا امر — ہو کر اسیر و قیدی زندان ریختہ
لیکن نہیں مجال کہ ہو ہاتھ کی پہنچ — تا گیسوئے مجعد و پیچان ریختہ
دیگر دعا یہ کرتا ہے سائل بچشم نم — مقبول ہو یہ گوہر غلطان ریختہ
قدر اس کی اہل فن کریں تو اسکا اہل ذوق — دلدادگان عارض خوبان ریختہ

مومن کی یہ حیات بنے عرش کی برات
ہوں مستفید اس سے سخندان ریختہ

اعلان عام

حق تصنیف کتاب ہذا حیات مومن
مع تاریخ مومن محفوظ ہے کوئی صاحب
بغیر اجازت طبع نہ فرماویں ورنہ قانونی
طور پر جوابدہ ہونگے / سید اشتیاق حسین شوق
دریبہ کلاں دہلی

کتبہ سید احمد کلیم جمیل لال دروازہ دہلی

سلکِ مروارید

مع تصویر حضرت مسیح الملک مرحوم و حضرت ظہیر دہلوی مرحوم

دوسرا ایڈیشن

اِس کتاب کے تین حصے ہیں: حصۂ اوّل میں حکما اور بزرگانِ دین کی زرین نصیحتوں کا بیش بہا خزانہ ہے۔ حصۂ دوم میں مشاہیر ہند کے قطعات اور نظموں کا پُرلطف ذخیرہ ہے۔ حصۂ سوم میں شعراء کے مقبول کلام اور غزلیات کا انتخاب ہے۔ جسکا ہر شعر شمشیر بے نیام ہے اسکی مقبولیت اور خوبیوں کا اندازہ صرف ہندوستان کے مشہور انشا پرداز مصور فطرت جناب خواجہ حسن نظامی صاحب دام افضالہم کی رائے کو ملاحظہ فرماکر ہوسکتا ہے۔ ایکبار ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ وہ فرماتے ہیں:۔ "سلک مروارید نام ایک کتاب کا ہے جسمیں دینی موتی ہیں، نظم کی لڑیاں ہیں، نثر کے ہار ہیں، جسمیں عقل و دماغ، آنکھ، کان اور سب کے راجہ دلارے دِل، کی مست کرنے والی باتیں ہیں۔ بچّوں کے لیے مفید اور آسان۔ عورتوں کے واسطے محرم راز مونس، اور جو بڑی عمر کے اور جوان سن کے اصحاب ہیں انکو تو اس کتاب میں علم و ادب کی سطر سطر میں دلچسپیاں ملیں گی۔ خوب چھپی ہے۔ شاندار انداز ہے۔ نفیس ہے تو یہ ہے کہ قیمت کم رکھی ہے جسپر مبلغ لکھا۔ شرح بالا کن کہ ارزانی ہنوز۔ بلاک کی چھپی ہوئی تصویریں حضرت مسیح الملک مرحوم نیز حضرت ظہیر دہلوی مرحوم کتاب کی دلچسپی کے لیے مزید برآں ہیں"۔ قیمت ۸ کلیات مومن قیمت عہ +

پتہ:۔ سید اشتیاق حسین۔ بازار دریبہ کلاں۔ دہلی

نوٹ:۔ ہندوستانی دواخانہ دہلی سے بھی یہ کتاب مل سکتی ہے +